محبت کا عذاب

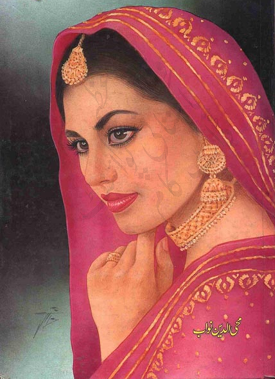

محی الدین نواب

جب وہ دس برس کا تھا، تب ہندوستان میں گونگی فلمیں تیار ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ دفتر کا چپڑاسی تھا۔ شوٹنگ کے وقت وہ سٹوڈیو میں اوپری کام کیا کرتا تھا۔ سب اسے شینخو کہہ کرپکارتے تھے۔ اوپری کام کرنے والے بچے حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی سماج میں ان کے نام کے ساتھ "ابے" لگایا جاتا۔ "ابے شینخو!"

اسے یہ بچگانہ گالی پسند نہیں تھی۔ وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ فلمسازوں اور ہدایتکاروں کے پاؤں داتبے داتبے وہ بیس برس کی عمر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن گیا۔ وہ بچگانہ گالی کے بجائے تگڑی سی گالی چاہتا تھا جو اس کی عمر کے مطابق اس کی صلاحیتوں کے مطابق شایانِ شان ہو۔ کیونکہ اس دنیا میں لوگ دوسروں کی صلاحیتوں کے مطابق گالیاں دیتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ گالیاں ان کی شہرت کا سبب بن جاتی ہیں۔ وہ شینخو سے جناب شیخ بختیار صاحب بن گیا۔

اچانک پچیس برس کی عمر میں ایک فلمساز اور ایک ہدایتکار کے درمیان سخت جھگڑا ہوگیا۔ جھگڑا اس بات پر ختم ہوا کہ فلمساز نے اس ڈائریکٹر کو فلم سے نکال دیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر شینخو تھا لہٰذا پھر ایک بار شینخو کا مقدر چمک گیا۔ اس کی فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ اس طرح راتوں رات وہ مقدر کا سکندر ہوگیا۔ شینخو سے شیخ صاحب بن گیا۔

کس کی مجال تھی کہ اب کوئی اسے چپڑاسی یا اوپری کام کرنے والا ملازم سمجھتا۔ جس کی فلم ہٹ ہوتی ہے۔ وہ قسمت کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ حتیٰ کہ فلموں میں لاکھوں روپے خرچ کرنے والا فلمساز بھی اسے شیخ صاحب کہنے لگا۔ اس نے دوسری تیسری فلمیں بنائیں جو لاکھوں کروڑوں روپے کا بزنس کرتی چلی گئیں۔ وہ بنگلہ اور موٹر کار کا مالک بن گیا۔ بڑے بڑے کروڑپتی سیٹھ اس کی فلموں میں بڑی سے بڑی رقم لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ فلموں میں آنے والی خوب صورت لڑکیاں اس پر عاشق ہوتی رہتی تھیں۔ جس لڑکی

پر اس کی نظرِ کرم ہوتی تھی۔ وہ اس کی اگلی فلم کی ہیروئن بن جاتی تھی۔

اس کے عروج کا یہی زمانہ تھا کہ اس کی زندگی میں شبانہ آگئی۔ ایک روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور اپنے منشی سے ایک فلم کی کہانی لکھوا رہا تھا۔ ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں کہانی نویس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ ناک پر عینک پہن کر کان میں قلم اٹکا کر ڈائریکٹر کے منہ سے کہانی سنتا ہے۔ سرہلاتا جاتا ہے پھر کان پر سے قلم نکال کر لکھنے لگتا ہے۔ فلمی دنیا میں ایسے شخص کو منشی کہتے ہیں۔ شیخو ایسے ہی ایک منشی سے کہانی لکھوا رہا تھا کہ ایک فلمی چمچے نے آکر اطلاع دی کہ ایک آدمی فسٹ کلاس مال لے کر آیا ہے۔

مال کا مطلب چھوکری تھا۔ شیخو نے کہا۔ ''اگر فرسٹ کلاس ہے تو لے آؤ اور منشی جی اب تم جاؤ۔ باقی کہانی شوٹنگ کے وقت سیٹ پر لکھی جائے گی۔''

منشی عینک اور قلم سنبھالتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کوئی بارہ تیرہ برس کی لڑکی تھی۔ شیخو بدستور دروازے کی طرف نظریں جمائے رہا۔ اسے فرسٹ کلاس چھوکری کا انتظار تھا۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ ''شیخ صاحب! میرا نام جوگی پرشاد ہے۔ یہ میری بیٹی شبانہ ہے۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔''

شیخو نے گھنٹی بجا کر چمچے کو بلایا۔ پھر پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا؟''

چمچے نے شبانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضور شیخ صاحب! یہی تو وہ فتنہ ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ کیا تیکھے تیور ہیں۔''

''ابے گدھے کے بچے! یہاں فتنے کی نہیں قیامت کی ضرورت ہے۔''

جوگی پرشاد نے کہا۔ ''مائی باپ! آپ کے پاس تو کمال ہے۔ آپ فتنے کو قیامت بنا سکتے ہیں۔''

''مگر یہ تو ابھی بچی ہے۔''

''چمچے نے کہا۔ ''حضور! یہی بچی تو ہوگی جو ستائے گی جوانوں کو جواں ہوکر۔''

''گیٹ آؤٹ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ سارا نشہ چوپٹ کر دیا تُو نے۔''

چمچہ باہر چلا گیا۔ جوگی پرشاد نے کہا۔ ''بچی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ رام لیلا میں سیتا کا پارٹ ادا کرتی ہے۔''

شیخو نے کہا۔ ''مجھے اپنی آئندہ فلم کے لیے جوان ہیروئن چاہیے اور ہاں کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''شبانہ۔ اس کا نام شبانہ ہے۔ نام کا کیا ہے آپ جو چاہیں رکھ لیں۔''

''لیکن تمہارا نام جوگی پرشاد ہے۔ تم ہندو ہو۔ بیٹی مسلمان ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟''

''اس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ اس کا باپ میرا دوست تھا۔ دوستی کے ناطے میں نے اس لڑکی کی پرورش کی۔ آپ مسلمان ہیں شیخ صاحب! میں نے سوچا آپ کو ایک مسلمان لڑکی سے ہمدردی ہوگی۔ اس لیے میں کسی ہندو ڈائریکٹر پروڈیوسر کے پاس نہیں گیا۔ سیدھا آپ ہی کے پاس لے آیا ہوں۔''

شیخو نے شبانہ کو دیکھا۔ جوگی پرشاد نے اسے حکم دیا۔ ''مسکراؤ۔'' وہ مسکرانے لگی۔ وہ گورے رنگ کی خوب صورت ناک نقشہ والی لڑکی تھی۔ اس کا حسن جوانی میں اور زیادہ نکھرنے والا تھا مگر ابھی بچی تھی۔

جوگی پرشاد نے التجا کی۔ ''اسے اپنے پاس رکھ لیجیے۔ ایک رات میں ہیروئن بنا دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

شیخو نے پوچھا۔ ''تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم اسے بھی اتنی کم عمری میں یہاں لے آتے؟''

وہ بے حیائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری اپنی بیٹی سندر نہیں ہے۔ ویسے شبانہ کو میں اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔''

شبانہ نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''شیخ صاحب! میں آپ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

شیخو کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جوگی پرشاد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''ٹھیک ہے بیٹی! تم اکیلے میں باتیں کرو۔ میں باہر بیٹھا رہوں گا۔''

وہ اپنی دھوتی کی لانگ سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شبانہ میز کے دوسری طرف سے گھوم کر شیخو کے پاس آئی۔ پھر بولی۔ ''مجھے بوتل سے گلاس میں شراب انڈیلنا آتا ہے۔ آپ کو پلاؤں؟''

اس لڑکی کی بے باکی پر شیخو کو پسینہ آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے اتنی سی عمر میں شراب پلانا کہاں سے سیکھ لیا؟''

"میں اتنی سی نہیں ہوں۔ میرا باپو (باپ) مجھے مار مار کر ناچنا سکھاتا ہے۔ بڑا جلاد ہے۔ شراب کے نشے میں میری اس لیے پٹائی کرتا ہے کہ میں جلدی جوان کیوں نہیں ہوتی۔ میں اس کے ڈر سے جوان عورتوں جیسے کام کرتی ہوں۔ مجھے اتنی سی نہ کہو۔"

وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ شریف گھرانوں میں تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیٹیاں جلدی جوان نہ ہوں۔ بابل کے آنگن میں گڑیاں کھیلتی رہیں اور کچھ گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں بیٹیوں کے جلد جوان ہونے کی دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں اور دوائیں بھی کھلائی جاتی ہیں تاکہ جلدی کاروبار شروع ہو سکے۔ شبانہ ایسی ہی تھی جو وقت سے بہت پہلے جوان بنائی جارہی تھی۔

شیخو نے اس سے پوچھا۔ "تم کیا کام کرسکتی ہو؟"

"میں وہ تمام کام کرسکتی ہوں جو ایک عورت کو کرنا چاہیے میں کھانا پکا سکتی ہوں۔ برتن مانجھ سکتی ہوں۔ باپو نے مجھے سکھایا ہے کہ کس طرح کسی کے بھی گھر میں جھاڑو پھیری جاسکتی ہے۔"

"اچھا تم کیا کام آسکتی ہو؟"

"میں تمہاری فلموں میں کام آسکتی ہوں۔ محبوبہ سے لے کر بیٹی تک کا رول ادا کرسکتی ہوں۔ اس سنسار میں بیٹی تو کوئی بناتا نہیں ہے۔ میں تمہاری محبوبہ بن سکتی ہوں۔ بس ایک بار فلم میں ہیروئن بنا دو میرے باپو سے کنٹریکٹ سائن کرلو۔ نہیں تو ناکام گھر واپس جاکر میری پٹائی کرے گا۔"

"دیکھو ابھی تو میں تمہیں ہیروئن نہیں بنا سکتا۔ پہلے میں دیکھوں گا کہ تم میری ہیروئن بن سکتی ہو یا نہیں۔ پہلی فلم میں' میں تمہیں ایک کم عمر ہیروئن کا رول دوں گا۔ اس کے لیے تمہیں سخت محنت کرنی ہوگی۔"

وہ شبانہ سے ایک یادگار ملاقات تھی۔ وہ ایسی عجیب و غریب لڑکی تھی جسے نہ تو بھلایا جاسکتا تھا اور نہ ہی اس وقت ٹالا جاسکتا تھا۔ اس نے جوگی پرشاد سے معاہدہ کرلیا کہ شبانہ اس کے پاس بارہ گھنٹے رہا کرے گی۔ اس کے پرائیویٹ گھر کا کام کرے گی۔ دفتر میں ریہرسل کرے گی اور سٹوڈیو میں ایکٹنگ کرے گی۔ اس کے عوض ہر ماہ اسے پچیس روپے پگار (تنخواہ) ملا کرے گی۔ کھانا کپڑا الگ سے ملے گا۔ ان دنوں پچیس روپے آج کے پچیس سو سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ جوگی پرشاد شیخو کا داس (غلام) بن کر رہ گیا۔

شبانہ نے پہلی فلم "بنارس کے ٹھگ" میں ایک بڑی عمر کی بچی اور کم عمر حسینہ کا رول ادا کیا۔ یہ فلم ایک برس میں تیار ہوئی۔ ایک برس میں شبانہ کی عمر بھی کچھ اور بڑھ گئی۔ جب وہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کا کام بہت پسند کیا گیا۔ کتنے ہی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اسے اپنی فلم میں بچی کا رول دینے کے لیے تلاش کرنے لگے۔ کیونکہ اب وہ فلم والی بچی نہیں رہی تھی شیخو نے ایک برس میں اسے جوان بنا دیا تھا۔ اسی لیے کسی پروڈیوسر' ڈائریکٹر کو وہ بچی نظر نہیں آئی۔

دوسری فلم "دشمن" میں شیخو نے اسے سائڈ ہیروئن کے لیے کاسٹ کیا۔ اسکرپٹ میں اس کا بہترین کردار لکھا گیا۔ ریہرسل میں بڑی محنت کرائی گئی۔ شوٹنگ کے دوران اس کے کئی ری ٹیک شاٹس لیے گئے۔ جب وہ فلم ریلیز ہوئی تو تہلکہ مچ گیا۔ فلم کی ہیروئن سے زیادہ سائڈ ہیروئن شبانہ کو پسند کیا گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی بڑی بڑی تصویریں شائع ہونے لگیں۔ بڑے بڑے فلمساز اسے بطور ہیروئن کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہوگئے لیکن شیخو سے پانچ برس کا معاہدہ تھا۔ اس لیے وہ دوسری فلموں میں ہیروئن بننے کے لیے ترس کر رہ گئی۔

اسے پہلی بار شیخو پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ اب وہ اسے ہیروئن کے طور پر اپنی فلموں میں کاسٹ کررہا تھا۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ جوگی پرشاد بھی یہی چاہتا تھا کہ راتوں رات کوٹھی کار اور بھاری بینک بیلنس مل جائے۔ معاہدے کی رُو سے شبانہ پانچ برس تک کسی دوسرے کی فلم میں کام نہیں کرسکتی تھی۔ معاہدے کے دو برس گزر گئے تھے۔ ابھی تین برس کا طویل عرصہ باقی تھا اور انہیں معاہدہ توڑنے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔

شبانہ اور جوگی پرشاد کسی ایسے بہانے کی تلاش میں رہنے لگے جسے بنیاد بنا کر وہ شیخو کو پانچ سالہ معاہدہ توڑنے پر مجبور کرسکتے۔

پھر ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی جس سے شبانہ نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہوا یہ کہ شیخو اور شبانہ کے جسمانی تعلقات سے ایک نیا وجود شبانہ کے جسم میں پرورش پانے لگا۔ جونہی شبانہ کو اس تبدیلی کا احساس ہوا اس نے شیخو کو یہ خبر سنائی۔ یہ سن کر شیخو سناٹے میں آگیا مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر کہا۔ "میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟"
اس نے شیخو سے کہا۔ "مجھ سے فوراً ہی شادی کرلو نہیں تو تمہارا بچہ ناجائز کہلائے

گا۔"

"میں شادی نہیں کرسکتا۔ میری بیوی بڑی ظالم ہے وہ مجھے دوسری شادی نہیں کرنے دے گی۔"

"پھر بچے کا کیا ہوگا؟"

"اسے ضائع کردو۔"

"اپنے بچے کو ضائع کرنے کو بولتے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"

"میرے چار بچے پہلے سے ہیں۔ مجھے پانچویں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ غصہ میں بولی۔ "مجھے ضرورت ہے۔ سنا ہے یوں کرنے سے صحت خراب ہوجاتی ہے صحت نہیں رہے گی تو میں دو چار مہینے فلم میں کام نہیں کرسکوں گی۔ تمہاری میری فلم ادھوری رہ جائے گی۔"

شیخو نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔ اب غور کرنے پر حساب لگایا تو پتہ چلا کہ شبانہ کا کام دو مہینے میں مکمل نہ کیا گیا تو پھر وہ زچگی کے بعد بھی دو چار ماہ فلم میں کام کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔ اس نے فیصلہ سنایا۔ میں کل ہی سے شوٹنگ کا شیڈول تیار کرتا ہوں۔ دو ماہ کے اندر اپنی فلم میں تمہارا کام مکمل کرلوں گا۔"

"میں تمہاری فلم میں کام نہیں کروں گی۔"

"معاہدے کی رُو سے تمہیں کرنا ہوگا۔"

"معاہدے میں بچہ شامل نہیں تھا۔ پہلے بچے کا فیصلہ کرو۔"

"بچہ نو ماہ بعد ہوگا۔ فلم کو دو ماہ میں مکمل ہونا چاہیے۔"

"پہلے بچے کا کام مکمل ہونا چاہیے۔ میں شادی کے بعد کام کروں گی۔"

وہ غصہ میں میز پر گھونسہ مارتے ہوئے بولا۔ "میں تم سے زبردستی کام کرواؤں گا۔"

وہ جواباً میز پر گھونسہ مارتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری گھروالی کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اسے بتاؤں گی کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "ارے خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ وہ پہرہ دینے کے لیے روز اسٹوڈیو میں آنے لگے گی۔ روز میری شوٹنگ فیل کرائے گی۔"

"تو پھر مجھے بدنامی سے بچاؤ۔ شادی کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ میں ہیروئن بننے سے پہلے سارے ہندوستان میں بدنام ہوجاؤں۔"

"میں تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے ذرا سوچنے کا موقع دو۔"

اسی شام شیخو ایک دوسرے ڈائریکٹر وجے دت کے ساتھ بیٹھ کر پی رہا تھا۔ باتوں باتوں میں شبانہ کا ذکر آگیا۔ وجے دت نے کہا۔ "میرا پروڈیوسر کروڑپتی ہے۔ وہ شبانہ کو میری فلم میں کام کرنے کے پچاس ہزار روپے دے سکتا ہے۔"

شیخو نے سینہ تان کر کہا۔ "مگر شبانہ میری داشتہ ہے۔ معاہدے کے مطابق وہ مزید تین سال تک کسی فلم میں کام نہیں کرے گی۔"

وجے دت نے کہا۔ "تمہارا کیا بگڑے گا اگر شبانہ میری ایک فلم میں کام کرلے گی۔ اس کے بدلے میں تمہارے کسی کام آجاؤں گا۔ میں یاروں کا یار ہوں۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

شیخو کو اچانک یاد آیا کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اور یہ وجے دت کو آزمانے کا اچھا موقعہ ہے۔ اس نے کہا۔ "میں ایک مصیبت میں ہوں۔"

"مصیبت بیان کرو۔ میں دور کروں گا۔"

"مصیبت یہ ہے کہ شبانہ دس ماہ سے پہلے شوٹنگ میں حصہ نہیں لے سکے گی۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بھئی مبارک ہو۔"

"کیا خاک مبارک ہو۔ وہ کہتی ہے کہ میں اس سے شادی کروں۔ نہیں کروں گا تو وہ زچگی سے پہلے فلم میں کام نہیں کرے گی اور میری بیوی کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"پھر تو واقعی تم مصیبت میں ہو۔"

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟"

"تم جو کہو گے وہ کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ شبانہ کو میری فلم میں کام کرنے دو۔"

"مجھے شرط منظور ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بچہ ناجائز نہ کہلائے میں اسے راضی کروں گا کہ وہ کسی سے بھی شادی کرکے اسے بچے کا باپ بنالے۔ کیا تم اس سے شادی کرو گے؟"

"ایں میں۔ میری تو شادی ہوچکی ہے تم جانتے ہو کہ ہمارے دھرم میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کی جاسکتی مگر میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہوں۔ مجھے ایک بار شبانہ سے تنہائی میں بات کرلینے دو۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میرے گھر آجاؤ۔ میں ملاقات کرا دوں گا۔"

دوسری صبح شیخو نے شبانہ سے کہا۔ "آج ڈائریکٹر وجے دت تم سے ملنے آئے گا۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "سچ؟ وہ کیوں ملنے آئے گا؟ کیا تم مجھے اس کی فلم میں کام کرنے کی اجازت دو گے؟"

"ہاں۔ اس شرط پر اجازت دوں گا کہ تم دو ماہ کے اندر میری فلم کی شوٹنگ مکمل کرلو گی۔"

"میں کرلوں گی مگر پہلے معاہدہ ہونا چاہیے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "تریا چلتر یعنی عورت کی مکاری اسی کو کہتے ہیں۔ کل تک تم کام کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ آج دوسری فلم میں کام کرنے کی آزادی ملتے ہی تم راضی ہوگئیں۔"

"عورت مردوں سے ہی مکاری سیکھتی ہے۔ میرے باپو نے مجھے سکھایا ہے کہ مرد ذات پر کبھی بھروسہ نہ کرو اور ٹھیک ہی سکھایا ہے۔ پہلے تم مجھ پر مرتے تھے۔ بچے کا ذکر سنا تو سارا عشق ٹھنڈا ہوگیا۔ اب وجے دت سے ملا رہے ہو تو اس میں بھی کوئی چال ہوگی اور بدنام عورت ہوتی ہے کہ ہم مکار ہیں۔"

"تم بہت زیادہ بولتی ہو۔ بہرحال اسے یاد رکھنا کہ میں نے صرف وجے دت کی فلم میں کام کرنے کی اجازت دی ہے۔"

"اگر تم نے اپنے معاہدے کے خلاف کسی غیر کی ایک فلم میں بھی کام کرنے کی اجازت دی تو وہ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا پھر میں آزاد ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے جتنی فلمیں ملیں گی میں کام کرتی جاؤں گی۔ تم مجھے نہیں روک سکو گے۔"

شیخو نے پریشان ہوکر ناگواری سے کہا۔ "جب تم میرے پاس آئی تھیں تو بچی تھیں۔ اب کیسی جہاندیدہ عورت کی طرح بول رہی ہو۔"

"مجھے بچی سے جہاندیدہ عورت تم نے ہی بنایا ہے اب کیوں پچھتا رہے ہو؟"

جس طرح استاد حضرات اپنے شاگردوں کو تمام داؤ پیچ سکھانے کے بعد پچھتاتے ہیں۔ اسی طرح اکثر ڈائریکٹر کسی حسینہ کو اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کے بعد پچھتایا کرتے ہیں۔ ہیروئن کی حیثیت سے شہرت ملتے ہی حسین لڑکیاں پھر دام میں نہیں رہتیں۔ جال توڑ کر پھُر سے اُڑ جاتی ہیں۔ شبانہ کو بھی اڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ شیخو کے لیے مشکل یہ

تھی کہ وہ اسے بے وفا نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود اپنے بچے کو قبول نہ کرکے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

شام کو وجے دت آیا تو شبانہ نے کہا۔ "تم لوگ عورت کو طوائف بنانے کے اچھے ہتھکنڈے جانتے ہو۔ دو برس میں فلم انڈسٹری نے مجھے سکھا دیا ہے کہ ہیروئن بننے کے لیے پہلے فلمساز اور ہدایت کار کی سیج پر جانا پڑتا ہے۔ وجے بابو تم بھی مجھ سے یہی فرمائش کرو گے تو پھر ہم شیخ صاحب کے گھر میں بیٹھ کر باتیں کیوں کریں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

وجے دت نے کہا۔ "شیخ صاحب! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ شبانہ کو آج رات کے لیے اپنے ہاں لے جاؤں۔ وہاں ذرا کھل کر باتیں ہوسکیں گی۔"

شیخو کو ہونے والے بچے سے پیچھا چھڑانا ہی تھا۔ اس لیے اس نے اجازت دے دی۔ شبانہ باہر وجے دت کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ بہت ہی پرانے ماڈل کی کھٹارا گاڑی تھی۔ چلتے وقت دائیں بائیں ڈگمگاتی تھی۔ ان دنوں مشہور ہدایت کاروں کے پاس ایسی ہی گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں بیٹھ کر وہ اس وقت کے رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ وجے دت کو شبانہ کے ساتھ جاتے ہوئے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ پریشان تھا۔ بار بار کن انکھیوں سے شبانہ کو دیکھ رہا تھا جیسے کسی خاص مقصد کے لیے اسے ناپ تول رہا ہو۔

گھر پہنچ کر اس نے بتایا کہ اس کی بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اس نے وہسکی کی بوتل اور گلاس نکالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم پیتی ہو؟"

"نہیں۔ سنا ہے کہ شراب عیاشی کے لیے پی جاتی ہے یا پھر اس سے غم غلط ہوتا ہے۔ جب مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے تو میں پینا شروع کر دوں گی۔"

وہ پینے لگا۔ کہنے لگا۔ "میں بہت غم کا مارا ہوں۔ دنیا میں مجھ جیسا دکھی انسان کوئی نہ ہوگا۔"

"پہلے میں بھی یہی سوچتی تھی جب باپو مجھے مار مار کر نچاتا تھا تو میں سمجھتی تھی کہ مجھ جیسی بدنصیب کوئی نہ ہوگی۔ اب پتہ چلا کہ تقدیر کوڑے مار مار کر نچا نچا کر کسی کو ہیروئن بناتی ہے تو کسی کو ڈائریکٹر کسی کو لیڈر اور کسی کو گیدڑ بنا دیتی ہے۔ آدمی کو کچھ بننے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے۔ تب وہ ناچ ناچ کر کچھ بن جاتا ہے۔"

"تم بہت بولتی ہو۔ دوسروں کی بھی سنا کرو۔ یقین جانو میں بہت دکھی اور پریشان ہوں۔"

"کیا دکھ ہے؟ کون پریشان کرتا ہے تمہیں؟"

"میری بیوی۔"

"وہ شیخو بھی اپنی بیوی کی شکایتیں کرتا ہے۔ کیا تم لوگوں کی نظروں میں بیویاں ظالم ہوتی ہیں۔"

"میں نے اپنی بیوی کو ظالم تو نہیں کہا۔ وہ تو اتنی پیاری ہے کہ اس کے حسن اور اس کی وفاداری نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

وہ حیران ہو کر بولی۔ "تعجب ہے۔ بیوی کی وفاداری نے تمہیں کیسے پریشان کیا ہے؟"

"بس میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ طلاق لے کر چلی جائے مگر وہ بے انتہا شوہر پرست ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی خوبیاں کیسے بیان کروں؟"

"تم اپنی خرابیاں بیان کرو کہ ایک نیک بخت سے تم پریشان کیسے ہو جاتے ہو۔"

اس نے گلاس میں شراب ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "اگر میں اپنا ایک گھریلو راز تمہیں بتاؤں تو کیا تم ہمیشہ اسے راز رکھ سکو گی؟"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔ تمہارے گھر کی بات شیخ صاحب یا اور کسی صاحب کو نہیں بتاؤں گی۔"

"تو پھر سنو۔ تین برس پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تین برس تک میرے گھر والے مجھے پریشان کرتے رہے اور میں انہیں ٹالتا رہا۔ مجھے صرف شراب سے محبت ہے۔ شباب سے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر میری ماں نے مرنے سے پہلے قسمیں دے دے کر میری شادی لکشمی سے کرا دی۔"

اس نے شراب کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "لکشمی بہت اچھی بہت سندر اور شوہر پرست عورت ہے۔ میں اس کی خوبیاں کیسے بیان کروں؟"

"تم بس اپنی خرابیاں بیان کرو۔"

"میری خرابی یہ ہے کہ میں لکشمی کو سب کچھ دے سکتا ہوں مگر پیار نہیں دے سکتا۔ شادی کو تین برس ہو گئے لکشمی ابھی تک ابھی تک ...." وہ کوشش کے باوجود

کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں اسے سچ مچ کی سہاگن نہیں بنا سکتا۔ وہ مجھ پر تھوک کر چلی جائے۔"

اس نے تھوک نگلنے کے انداز میں شراب کو نگلتے ہوئے کہا۔ "لکشمی پتی ورتا ہے۔ وہ مر کر ہی میرے گھر سے نکلنا چاہتی ہے۔ میں نے ایسی وفاداری بیوی نہیں دیکھی۔ وہ میرے اور اپنے خاندان والوں کے سامنے ہنستی بولتی رہتی ہے اور اندر ہی اندر جوانی کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ اس نے میری شرم رکھی ہے۔ مرتے دم تک وہ کسی کے سامنے میری کمزوری کا ذکر کبھی نہیں کرے گی۔"

شبانہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔ "ہائے بیچاری اپنے اوپر کیسا ظلم کر رہی ہے۔ وہ تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتی مگر تم زبردستی اسے چھوڑ دو۔ تو یہ نیکی ہوگی۔"

"میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے اور اس کے خاندان والوں کے سامنے چھوڑنے کی وجہ بتانی ہوگی۔ جس کمزوری کو میں چھپاتا رہا ہوں، اسے کیسے بیان کردوں۔ میں شرم سے کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ میری مردانگی کا بھرم نہیں رہے گا تو میں مر جاؤں گا۔"

"پھر تو تمہیں مر جانا چاہیے۔ وہ بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی کر سکے گی۔"

"زندگی بہت خوب صورت ہے اور یہ زندگی ہمیں ایک ہی بار ملتی ہے۔ اس لیے میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے ہمدردی کرو۔"

"کیسے کروں؟"

"دیکھو وہ بیوی بن کر بہل نہیں سکتی۔ ماں بن کر بہل جائے گی۔ وہ ایک بچے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ تم اپنے ہونے والے بچے کو اس کی گود میں ڈال دو۔"

"عورت سب کچھ دے دیتی ہے۔ اپنا بچہ کسی کو نہیں دیتی۔"

"مگر تم بیاہتا عورت نہیں ہو۔ بچہ ہمیں نہیں دو گی تو اسے گود میں رکھ کر بدنام ہو جاؤ گی۔ ابھی تمہاری شہرت کی ابتدا ہوئی ہے، وہ سب خاک میں مل جائے گی۔"

"میں فوراً ہی کسی سے شادی کر لوں گی۔"

"تم شادی کرو گی تو یہ خبر اخباروں میں چھپے گی۔ فلم دیکھنے والے ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتے ہیں۔ شادی شدہ کو دیکھنا ہو تو وہ اپنے گھروں میں بیوی کو دیکھ کر بہل سکتے

ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا والوں کو پرائی عورت حسین اور کنواری لگتی ہے۔ تمہیں بھی ایسی ہی لگنا چاہیے۔ شادی کرو گی تو تمہاری فلمیں فلاپ ہو جائیں گی۔ پھر کوئی تمہیں کاسٹ نہیں کرے گا۔"

یہ بات تو اس کا باپو بھی سمجھاتا تھا کہ کسی سے چلتا پھرتا عشق کرلینا۔ مگر شادی نہ کرنا۔ نہیں تو بڑھتی ہوئی شہرت پل بھر میں خاک ہوجائے گی۔ وجے دت کی یہ بات دل میں اُتر گئی کہ شادی کرنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ اخبار اور رسالے والے اس کی خفیہ شادی کو بھی خوب اچھالیں گے۔

وجے دت نے کہا۔ "تمہارے ساتھ وہ ہونے والا بچہ بھی بدنام ہوگا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی ناجائز پیدائش پر من گھڑت کہانیاں شائع کی جائیں گی۔ پھر وہ بچہ بڑا ہوکر تمہیں گالیاں دے گا۔"

"نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی مگر بچے کو ایک باپ کا نام ضرور ملنا چاہیے۔"

"میں اسے اپنا نام دوں گا۔ شادی کے بعد اب تک لکشمی نے میری عزت رکھی ہے لیکن اب ہمارے کنبے میں پوچھا جاتا ہے کہ بچہ کیوں نہیں ہوتا۔ لکشمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ہم کسی اناتھ آشرم سے کوئی بچہ گود لے کر آجائیں اور کنبے والوں سے کہہ دیا جائے کہ لکشمی بانجھ ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ تمہارے بچے کو گود لے لیا جائے۔ اس طرح میری مردانگی کا بھرم بھی رہ جائے گا۔"

"بھرم کیسے رہے گا؟"

"ایسے کہ تم اور لکشمی پانچ مہینے کے لیے کسی ایسے شہر میں رہو گی جہاں ہم لوگوں کو کوئی پہچانتا نہ ہو۔ میں گھر والوں سے بہانہ کروں گا کہ لکشمی کو چار ماہ کا حمل ہے اور میں اسے اپنے ساتھ دور ایک پہاڑی علاقہ میں فلم کی شوٹنگ کرنے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ فلمی صحافیوں کو تمہارے بارے میں یہی بیان دیا جائے گا جب تمہاری زچگی ہو جائے گی اور بچہ لکشمی کی گود میں آجائے گا تو پھر ہم وہاں سے واپس آکر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جائیں گے۔"

"اجنبی بن جانے کا مطلب کیا ہوا؟"

"یہی کہ تم کبھی لکشمی اور بچے سے نہیں ملوگی۔ وہ میرے نام سے پرورش پائے گا۔"

"میں اس کی ماں ہوؤں گی۔ میں اس سے ضرور ملوں گی۔"

"تم ماں کے رشتے سے ملنے آؤ گی تو میں اسے باپ کا نام کیسے دے سکوں گا۔"

"میں کسی سے نہیں کہوں گی کہ میں اس کی ماں ہوں۔"

"تم زبان سے نہیں کہوں گی مگر ماں کی آنکھیں ممتا کے جذبات یہ سب مل کر چغلی کھائیں گے۔ تم ابھی سے اپنے دل کو سمجھاتی رہو کہ بچے کو بدنامی سے بچانے کے لیے تمہیں اس سے دور رہنا ہوگا۔ تبھی اسے میرا اور میرے معزز خاندان کا نام ملے گا۔ ماں کو اتنی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔"

"میں قربانی دے سکتی ہوں مگر میرا دل چاہے گا کہ میں اپنی اولاد کے کسی کام آتی رہوں۔"

"جب بھی تمہارا جی چاہے تم میرے ذریعہ اس کے کام آسکتی ہو۔ ماں وہی ہے جو ممتا نہ جتائے بلکہ دور ہی سے ممتا کی ذمہ داریاں پوری کردے۔"

"ہائے میں زندگی کے کیسے موڑ پر آگئی ہوں۔ بچہ میرا ہوگا۔ تکلیف میں اٹھاؤں گی۔ پیدا میں کروں گی اور نام تمہارا ہوگا۔"

"دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ انڈا مرغی دیتی ہے۔ کھاتا آدمی ہے۔ وہ بچہ ایک پردہ ہوگا جو میری کمزوری کو چھپائے گا۔ وہ ایک اعلان ہوگا۔ میری مردانگی کو ثابت کرے گا۔ بس بات طے ہوگئی ٹھیک ہے؟"

شبانہ نے اپنے حالات پر غور کیا اور مان گئی۔ اس نے شیخو اور وجے دت کا موازنہ کیا تو وجے دت بہتر لگا۔ کیونکہ شیخو کامیاب ڈائریکٹر سہی مگر بنیادی طور پر چپراسی تھا۔ اس کے خاندان کا کوئی بڑا پس منظر نہیں تھا۔ اس کے برعکس وجے دت کامیاب ڈائریکٹر بھی تھا اور خاندانی آدمی بھی کہلاتا تھا۔ صرف ایک قباحت تھی کہ اس کا بچہ ہندو گھرانے میں پرورش پائے گا لیکن خود شبانہ بھی تو ایک ہندو گھرانے میں پرورش پاچکی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وجے دت اور لکشمی ضرور تمند تھے۔ بچہ ان کے لیے بڑی ہمیت رکھتا تھا۔ شبانہ کے بچے کو وہ اپنی جان سے لگا کر رکھتے اور پرورش کرتے۔ لہٰذا اس نے وجے دت کی بات مان لی۔

☆======☆======☆

پندرہ برس گزر گئے۔ اس طویل مدت میں شیخو نے کئی بار اپنا عروج و زوال دیکھا۔

کبھی اس کی فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں تو اسے ہندوستان کا عظیم ہدایت کار کہا جاتا۔ کبھی کوئی فلم فلاپ ہو جاتی تو اخباروں اور رسالوں میں وہ گھسیارا کہلاتا۔ پیسہ لگانے والے فنانسر اس کی طرف رخ نہ کرتے۔ فلمی دنیا میں بہت جلد کسی کی کامیابی اور صلاحیتوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فلمیں .... ذہانت اور صلاحیتوں سے تیار نہیں کی جاتیں۔ فلموں میں دولت صرف کرنے والے اسے تاش کی بازی سمجھتے ہیں۔ تقدیر کا جوا کھیلتے ہیں۔ کامیاب ہو جائے تو ہدایت کار باصلاحیت نہیں بلکہ خوش قسمت ہے اور ناکام ہو جائے تو وہی ہدایت کار بد قسمت کہلاتا ہے۔

شیخو کی مسلسل تین فلمیں فلاپ ہوئیں تو سیٹھوں اور مہاجنوں نے اس کی فلم میں پیسہ لگانا چھوڑ دیا۔ اسے طنزیہ انداز میں کہنے لگے۔ "فلاپ فلمیں پاکستان میں بنتی ہیں۔ تم مسلمان ہو، پاکستان چلے جاؤ۔ وہیں تمہارا گزارہ ہو گا۔"

مگر شیخو کو ہندوستان سے محبت تھی۔ وہ اسی دھرتی پر رہنا اور وہیں کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا تھا۔ اس نے پھر ایک بار کامیاب ڈائریکٹر کی حیثیت سے اُبھرنے کے لیے جی جان سے کوششیں کیں۔ کتنے ہی سیٹھوں اور مہاجنوں کو یقین دلایا کہ وہ منافع کمانے والی فلم بنائے گا لیکن زبان پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔ کچھ کر کے دکھانا ہوتا ہے اور کچھ کرنے کے لیے دولت نہیں تھی۔ تب اسے شبانہ یاد آئی۔

شبانہ اب عروج پر تھی۔ ایک فلم میں کام کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے معاوضہ لیتی تھی۔ اس کے جیسی دولت مند ہیروئنیں ہندوستان میں صرف دو چار ہی تھیں۔ شیخو اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شبانہ کے ملازم نے پہلے تو اسے دروازے سے داخل ہونے ہی نہیں دیا۔ جب شیخو نے جھوٹ کہا کہ وہ ہدایت کار ہے اور بی بی سے کنٹریکٹ سائن کرانے آیا ہے تو اسے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ کیونکہ ڈرائنگ روم میں وہ کسی دوسرے ہدایت کار سے آئندہ فلم کی کہانی سن رہی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب شبانہ ہیروئن بننے کے لیے شیخو کے دروازے پر گئی تھی۔ اب یہ زمانہ آ گیا تھا کہ وہ شبانہ کی دہلیز پر پھر ایک بار ڈائریکٹر بننے آیا تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک ویٹنگ روم میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ کسی نے ایک پیالی چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ ڈائننگ روم سے کھانے کے برتنوں کی آواز کے ساتھ کبھی کبھی قہقہے بھی سنائی دے رہے

تھے۔ کھانے کے بعد دوسرے ہدایت کار کی ٹیم چلی گئی۔ تب شبانہ نے اسے بلایا۔ شبانہ اب پہلے جیسی چھوکری نہیں رہی تھی۔ بھاری بھرکم حسین و جمیل عورت کے روپ میں نکھر آئی تھی۔ اسے اتنی شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ عام آدمی اس کے سامنے باتیں کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔

شیخو نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو......"

شبانہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "میرے پاس بکواس سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔ کیوں آئے ہو؟"

"میرے پاس ایک فلم کا دھانسو آئیڈیا ہے۔ سنو گی تو پھڑک جاؤ گی۔"

"میرے پھڑکنے کی عمر گزر چکی ہے۔ کسی اور کو بیوقوف بناؤ۔"

"شبانہ! اتنی بے رُخی سے بات نہ کرو۔ کبھی ہمارے درمیان بہت گہرا رشتہ تھا۔ میں تمہاری تنہائیوں کا........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ ایک بچہ ہوتے ہی تمہارا گہرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ اگر وجے دت میرے بچے کو گود نہ لیتا تو آج وہ بچہ ناجائز اور تم اس کے ناجائز باپ کہلاتے۔"

"اگر میں زبان کھول دوں تو تمہارا بچہ آج بھی بدنام ہو سکتا ہے۔"

وہ حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ نہ بھولو کہ تم بھی بدنام ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میرا تو نام ہو گا کہ ہندوستان کی ٹاپ کی ہیروئن سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا؟"

"کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو؟"

"تمہارا بچہ پندرہ برس کا ہو چکا ہو گا۔ سنا ہے بہت ذہین ہے اور عمدہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بڑے اونچے خاندان کا لڑکا سمجھا جا رہا ہے کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ کبھی کوئی اس کی اصلیت کو نہ سمجھے۔"

"ہاں میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میرا بیٹا بدنام ہو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس راز کی قیمت چاہتا ہوں۔ میں ایک فلم شروع کر رہا ہوں۔ تم اس میں رقم لگاؤ۔ منافع آدھا آدھا۔"

"مجھے فلم پروڈیوسر بننے کا شوق نہیں ہے۔"

"مگر مجھے ایک پروڈیوسر کی ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کی بھلائی کے لیے تم رقم لگاؤ گی۔"

"تم بلیک میل کر رہے ہو۔ کیا تم اپنے بچے کی نیک نامی نہیں چاہتے؟"

"میرا کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ میری بیوی مر گئی۔ بچوں نے جوان ہو کر ساتھ چھوڑ دیا۔ جب جائز اپنے نہ ہوئے تو ناجائز کو کون گنتا ہے۔ میں تمہارے بچے کے ذریعہ تمہیں بلیک میل کر کے اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتا ہوں۔ تمہاری دولت سے ایک سپرہٹ فلم تیار کر سکتا ہوں۔ میں اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ تمہاری جیسی چٹان کو صرف ممتا ہی جھکا سکتی ہے اور میں تمہاری ممتا سے کھیلنا چاہتا ہوں۔"

شبانہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر اس کے سامنے ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ عورت کو عورت کیوں نہیں رہنے دیتے۔ اسے روپیہ پیدا کرنے کی مشین کیوں بنا دیتے ہو؟ تمہارے بعد مجھے پریم کمار سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ غریب تھا۔ محنتی اور ایماندار تھا۔ تم نے اسے دیکھا ہے' وہ خوب صورت بھی ہے میں اس پر مرمٹی تھی۔ اپنے باپو کی نصیحت بھول گئی تھی کہ کسی سے سچا عشق نہ کرنا۔"

وہ ایک لمحہ کو رکی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ سالی فلم انڈسٹری بڑی کمینی جگہ ہے۔ یہاں صرف مطلب کے یارانے ہوتے ہیں۔ پریم کمار فلموں میں ہیرو کا چانس لینا چاہتا تھا۔ میری سفارش پر اسے ایک فلم میں کام ملا پھر دوسری فلم میں کام ملا۔ اس کے بعد وہ تیسری فلم کی ہیروئن سپنا کماری پر عاشق ہو گیا۔ کیونکہ سپنا کماری بھی بڑی ہیروئن ہے۔ اس کی بھی بڑی سفارش چلتی ہے۔ میں پریم کمار سے شادی کرنا چاہتی تھی اور سپنا کماری شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی اور مرد ایسی ہی عورت کو پسند کرتا ہے جو شادی نہیں صرف عشق کرتی ہے۔"

شیخو نے پوچھا۔ "تم مجھے یہ باتیں کیوں سنا رہی ہو۔"

"اس لیے کہ تم نے بھی ایسا ہی عشق کیا تھا۔ تم سارے مرد ایک جیسے ہو یوں لگتا ہے جیسے فلم انڈسٹری میں مرد نہیں ہوتے سب وجے دت .... ہوتے ہیں۔ اوپر سے کچھ اندر سے کچھ .... اب مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں' میں آئندہ کسی سے سچی محبت نہیں کر سکوں گی۔ صرف ماں بیٹے کا رشتہ ہی سچا رہے گا۔ میں

مرنے سے پہلے اپنی ساری دولت اور جائیداد اپنے بیٹے کے نام لکھ دوں گی مگر تم اس میں حصہ لگانے آ گئے ہو۔"

"میں جو فلم بناؤں گا اس سے تمہارے بیٹے کی جائیداد میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا ہماری فلم گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی منائے گی۔"

"اور اگر فلاپ ہو گئی تو؟"

"تمہارے بیٹے کی تقدیر اچھی ہے۔ فلاپ نہیں ہو گی۔"

"تم بلیک میلنگ کے لیے مجھ سے پانچ دس ہزار روپے لے لیا کرو۔ فلم بنانے کا خیال چھوڑ دو۔"

"فلم تو میں ضرور بناؤں گا اور تم رقم ضرور لگاؤ گی۔"

شبانہ نے اسے نفرت سے دیکھا مگر وہ مجبور تھی۔ بیٹے کی نیک نامی کی خاطر ایک بلیک میلر باپ کے آگے جھکنا پڑ رہا تھا۔ وہ حقارت سے بولی۔ "میں اسے پیدا کرنے کی گناہگار ہوں مگر ممتا کا سارا عذاب مجھے سہنا پڑ رہا ہے۔ باپ کی شفقت جیسے کچھ نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آ رہی ہے۔"

"میں تمہارے بیٹے کی جائیداد اور دولت میں اضافہ کرنے کے لیے فلم بنا رہا ہوں۔ میں اس کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میں جان بوجھ کر فلم فلاپ نہیں کراؤں گا۔ آخر میں بھی اس کا باپ ہوں۔ آخری بات بولو میری فلم میں رقم لگاؤ گی یا نہیں۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وجے دت کے پاس جو بیٹا ہے وہ تم سے ہے؟"

"میں اس کا ڈاکٹری معائنہ کراؤں گا۔"

شیخو نہیں جانتا تھا کہ وجے دت کی اصلیت اندر سے کیا ہے؟ لیکن ڈاکٹری معائنہ سے اصلیت ظاہر ہو سکتی تھی۔ بیٹا ایک پل میں گناہ کی پوٹ کہلا سکتا تھا۔ شبانہ نے پریشان ہو کر شیخو کی فلم میں رقم لگانے کی حامی بھر لی۔ شیخو اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اس سے پانچ ہزار روپے لے کر چلا گیا۔ ارادہ تھا کہ وہ دوسرے دن آ کر نئی فلم کی مہورت کے لیے پانچ لاکھ روپے کا چیک لے جائے گا۔

شبانہ اس روز بہت پریشان رہی۔ ہندوستان میں ایک اے کلاس فلم کا بجٹ ایک کروڑ روپے تک ہوتا ہے۔ بی کلاس فلمیں ساٹھ ستر لاکھ روپے تک بن جاتی ہیں اور وہ شیخو کی فلم میں اتنی بڑی رقم کا جوا نہیں کھیلنا چاہتی تھی۔

اس نے بہت سوچ بچار کے بعد وجے دت کو فون کیا۔ "وجے! میں بیٹے کی وجہ سے بہت مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ مجھ سے فوراً آ کر ملو۔ ورنہ یہ شیخو تمہیں برباد کردے گا۔"

وجے دت نے پوچھا۔ "شیخو اس معاملہ سے بالکل الگ ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہمیں برباد کیسے کرے گا؟"

"وہ کہتا ہے کہ میں اسے فنانس کروں۔ اس کی فلم میں رقم لگاؤں نہیں تو وہ دنیا والوں کو ہمارے بیٹے کی اصلیت بتا دے گا۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہو رہا ہے۔ میں بھی یہاں بہت پریشان ہوں۔ ابھی تمہیں آ کر بتاؤں گا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

آدھ گھنٹے بعد وہ شبانہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اس سے بولا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی اچھی سی وہسکی پلاؤ۔ سنا ہے آج کل تم بھی پینے لگی ہو۔"

"ہاں یاد ہے تم نے پہلی ملاقات میں مجھے شراب پینے کے لیے کہا تھا۔ میں نے جواب دیا تھا کہ جب مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے تو میں پینا شروع کر دوں گی۔ اب میں غم غلط کرنے کے لیے پیتی ہوں۔"

وہ دونوں وہسکی کی ایک بوتل اور گلاس لے کر پینے بیٹھ گئے۔ وجے دت نے کہا۔ "یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ دو برس پہلے لکشمی مر گئی تھی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں اپنے بیٹے کی دور ہی دور سے سب خبر رکھتی ہوں۔ اس کے ساتھ تمہارے خاندانی حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔"

وجے دت نے کہا۔ "لکشمی کے مرنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے سینے پر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا۔"

"تم ایسی وفادار بیوی کو بوجھ سمجھتے رہے۔ تم کیسے آدمی ہو۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی وفاداری ہی مجھے پریشان کرتی رہی۔ یہ بات میرے سینے پر بوجھ بن کر رہتی تھی۔ اس کے مرنے سے اطمینان ہوا کہ چتا کی آگ نے اسے جلا دیا۔ اب جوانی کی آگ کبھی نہیں جلائے گی۔"

"مگر تم فون پر کہہ رہے تھے کہ اب بھی پریشان ہو۔"

"ہاں پنجاب سے ایک بہت حسین لڑکی آئی ہوئی ہے۔ وہ ہیروئن بننے کا خواب دیکھ

رہی ہے۔ کل رات میں نے اس کے ساتھ بہت زیادہ پی لی۔ یہ سکھ لڑکیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ کم بخت چار گلاس پینے کے بعد بھی بولتی رہی۔ میں شیخی میں زیادہ پی گیا تھا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے بولی۔ "چل مینو ہیروئن بنا دے۔"

میں نے اُس سے انکار کیا۔ اُسے سمجھایا کہ میں اسے ہیروئن نہیں بنا سکتا مگر وہ سر ہو گئی۔ خم ٹھونک کر بولی۔ "تمہیں تو بنانا ہی پڑے گا۔" چونکہ میں بہت زیادہ پی گیا تھا۔ نشہ میں بہک رہا تھا۔ اس گڑبڑ میں' میں نے بتا دیا کہ اصل میں' میں کیا ہوں۔ میرا بھید اسے معلوم ہو گیا ہے۔"

شبانہ نے تشویش ظاہر کی۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"ہاں بہت بُرا ہوا۔ وہ سکھنی میرے بنگلے میں پڑی ہوئی ہے۔ کہتی ہے کسی فلم میں ہیروئن کا چانس دلاؤ۔ نہیں تو وہ میرا بھید کھول دے گی۔"

"شراب میرے لئے اچھی ہے کہ میرا غم غلط کرتی ہے۔ تمہارے لئے بُری ہے کہ تمہارا بھید کھولتی ہے۔ اب تو تم اسے کسی فلم میں چانس دے ہی دو۔"

"کیسے دوں؟ اُسے تو بولنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ بظاہر لڑکی ہے لیکن میں نے اس کا اسکرین ٹیسٹ لے کر دیکھا ہے وہ بڑے پردے پر بڑی عمر کی عورت لگتی ہے۔ وہ ہیروئن بننے کے قابل نہیں ہے۔"

"وہ ہمارے بیٹے کے بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے کہ وہ میرا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا۔ لکشمی نے کسی دوسرے سے منہ کالا کیا ہو گا۔ یہ بیچاری لکشمی پر بہتان ہے۔ وہ بیچاری جنم کی کنواری رہ کر مر گئی۔ اب دنیا اسے بدنام کرے گی۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔"

"تم نے اسے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اسے سمجھایا کہ لکشمی پوجا کئے جانے کے قابل تھی۔ اُس بیچاری پر کیچڑ نہ اچھالو۔ ہم اس بیٹے کو اناتھ آشرم سے لائے تھے مگر وہ حرام زادی یقین نہیں کرتی ہے۔ لکشمی کو بدنام کرنے پر تُل گئی ہے۔"

"میرا بیٹا بھی بدنام ہو جائے گا۔"

"میں بھی بڑے شرمناک طریقے سے بدنام ہونے والا ہوں۔"

"یہ شراب زیادہ پینے کا نتیجہ ہے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب ہم اس کے نتیجہ سے کیسے بچ سکتے ہیں۔"

شبانہ نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "جی چاہتا ہے۔ اس سکھنی کا گلا گھونٹ دوں۔ اسے سندور کھلا دو۔ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل سکے گی۔

"وہ اور زیادہ مصیبت بن جائے گی۔ کوئی اچھی سی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔"

"میں سمجھتی ہوں' عورت اتنی بے حیا نہیں ہوتی۔ کچھ بھی ہو' وہ سکھنی عورت ہے۔ اپنی زبان سے تمہارا بھید نہیں کھول سکے گی۔"

"ارے وہ تو ایسی سڑی گالیاں دیتی ہے کہ سن کر ہوش اڑ جاتے ہیں۔ وہ بڑی بے شرمی سے مجھے بدنام کرے گی۔ تمہارا بیٹا بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

شبانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں نے اپنا دکھڑا رونے کے لئے تمہیں بلایا تھا۔ تمہارے دکھڑے نے تو مجھے اور زیادہ پریشان کردیا ہے۔ اس سکھنی کو اچھی خاصی رقم کا لالچ دے کر اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ابھی جا کر اس کے پاؤں پکڑوں گا۔ اسے سمجھاؤں گا کہ میرے فلمساز اسے ہیروئن کے طور پر پسند نہیں کرتے ہیں۔ میں اسے ہیروئن کی ماں کا رول دوں گا اور موٹی رقم کا لالچ بھی دوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔"

"کہاں جاتے ہو؟ میری مصیبت کا کیا ہوگا۔ میں شیخو سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ سالا مسلمان ہے۔ ہندو غنڈے اسے دھمکی دیں گے کہ وہ پاکستان جا کر فلمیں بنائے۔ نہیں تو ادھر ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ تم ابھی اسے چیک دینے کے بجائے ٹالتی رہو۔ میں سکھنی سے نمٹ کر اسے سیدھا کردوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شبانہ کی تسلی نہ ہوئی۔ جب وہ اپنے دل کو دلاسہ دیتی کہ شیخو سے وجے دت نمٹ لے گا تو سوال پیدا ہوتا کہ سکھنی سے کون نمٹے گا؟ بیٹا جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت چھپی ہوئی بدنامی بھی جوان ہونا چاہتی تھی۔ اس نے فکر اور پریشانی میں کھانا نہیں کھایا۔ رات کو نیند بھی نہیں آئی۔ شراب نوشی کی زیادتی نے اسے دوسرے دن تک مدہوش رکھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وجے دت اس کے بستر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے وجے دت سے پوچھا۔ "تم ابھی تک گئے نہیں؟ یہیں بیٹھے ہوئے ہو؟"

وہ بولا۔ "شبانہ جی! اب ہوش میں آجاؤ۔ میں کل یہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ آج دوسرا دن ہے۔ تم نے تو پینے میں ہمیں بھی مات دے دی۔"

"آہ کیا کروں۔ غم غلط نہیں ہوتا۔ یہ بتاؤ اس سکھنی کا کیا ہوا؟"

"اس حرام زادی نے سب کچھ مٹی میں ملا دیا۔"

"کیا ہوا؟" شبانہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا وہ دنیا والوں کے سامنے بھید کھول رہی ہے؟"

"دنیا کو گولی مارو۔ اس نے ہمارے بیٹے کے سامنے بھید کھول دیا۔"

شبانہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔ "کیا میرے بیٹے کو معلوم ہوگیا۔"

"ہاں میں اس سکھنی کے ہاتھ پاؤں پڑ رہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ مجھ سے بڑی رقم لے لے مگر لکشمی کو بدنام نہ کرے۔ لکشمی نے اسے جنم نہیں دیا ہے بلکہ ہم اسے اناتھ آشرم سے لائے ہیں۔"

وجے دت نے اتنا کہہ کر گہری سانس لی پھر کہا۔ "اتنے میں ہمارا بیٹا ادھر مجھ سے ملنے آگیا۔ اس نے ساری باتیں سن لیں۔ اسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں اور لکشی اس کی ماں نہیں تھی۔"

شبانہ نے تڑپ کر پوچھا۔ "پھر تو اس نے پوچھا ہوگا کہ اس کی ماں کون ہے؟"

"ہاں اس نے اپنے ماں باپ کے متعلق پوچھا تھا۔ میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ تمہاری ناجائز اولاد ہے۔ بولو' کیا اسے یہ بتانا مناسب تھا؟"

"نہیں ناجائز ثابت ہوتے ہی وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے ذلیل اور کمتر انسان سمجھنے لگے گا۔ ہائے میں اسے دنیا کا سب سے اونچا انسان کیسے بنا دوں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ اسے اناتھ آشرم سے لایا گیا تھا۔"

"کیا اسے یقین آگیا؟"

"شاید وہ الجھن میں ہے۔ اس نے میرا گھر چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"کہہ رہا تھا کہ اب میرا گھر اس کے لئے اجنبی ہے۔ اب وہ خود محنت کرے گا اور اپنی کمائی سے روٹی کھائے گا۔"

"ہائے میرا بیٹا کتنا خوددار ہے مگر وہ کہاں گیا ہے؟"

"وہ پرکاش پروڈکشن میں کام حاصل کرنے گیا تھا۔ پروڈکشن منیجر نے چپ چاپ مجھے فون پر بتایا کہ میرا بیٹا ملازمت کے لئے آیا ہے۔ میں نے اسے چپکے سے سمجھا دیا کہ اسے ملازمت دے دی جائے۔ آخر کو وہ ایک دن میری طرح بہت بڑا ڈائریکٹر بنے گا۔ لہٰذا ابھی سے اسے فلمی دنیا کا تجربہ ہونا چاہئے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ وہ فلم انڈسٹری میں رہے گا تو ہماری نظروں کے سامنے ہر دم رہے گا۔ ہم اس کی ترقی کے لئے سفارشیں کرتے رہیں گے۔ اس کی کامیابی کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہیں گے لیکن شیخو کا کیا ہوگا؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں اس کا دھڑن تختہ کر دوں گا۔"

اسی رات وجے دت نے اپنے ہاں شیخو کو پینے کی دعوت دی اور بمبئی کے بدنام ترین غنڈوں کو بھی بلالیا۔ وہاں شیخو کو شراب پلا پلا کر مارا گیا۔ اچھی طرح اس کی پٹائی کرنے کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ وہ فلم انڈسٹری چھوڑ کر بمبئی سے چلا جائے۔ یا پھر شبانہ کے سلسلہ میں اپنی زبان بند رکھے۔ کبھی وہ زبان کھولے گا تو ہمیشہ کے لئے اسے خاموش کردیا جائے گا۔

شیخو کے سامنے کتنے ہی کھلے ہوئے چاقوؤں کے پھل بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے جیسے موت چمکیلے دانت کچکچا رہی ہو۔ وہ مرنے سے ڈرتا تھا۔ زندگی سے اسے پیار تھا۔ اس لئے اس نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ آئندہ شبانہ کے پاس نہیں جائے گا اور کسی طرح بھی اسے بلیک میل نہیں کرے گا۔

شبانہ نے ایک ماں کی حیثیت سے پھر بازی جیت لی۔ اپنے بیٹے کو بہت بڑی بدنامی سے بچالیا۔

☆========☆========☆

پانچ برس اور گزر گئے۔ فلم انڈسٹری میں شیخو کی ساکھ بالکل گر گئی۔ اسے ایک ڈائریکٹر کا چانس ملنا تو دور کی بات تھی۔ کوئی اسے اپنے فلمسازی کے ادارے میں ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

شیخو ہر وقت سستی شراب کے نشے میں دھت رہتا لوگ اس سے ملنے سے کتراتے اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہے بس اتنا سمجھتا تھا کہ یہ سب وجے دت

کی سازشیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیخو پھر ایک کامیاب ڈائریکٹر کی حیثیت سے اُبھرے اور وجے دت اور شبانہ کے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے۔ اس کی سازشوں نے اسے بھیک منگا بنا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایک بار چپراسی بننے کی نوبت آگئی تھی۔

کامیاب ہدایت کار بننے کے بعد اب اپنے زوال کے دور میں چپراسی بننا بڑی توہین کی بات تھی۔ مشکل یہ تھی کہ فلمی دنیا میں رہنے والا کسی اور شعبے میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ فلم نگری کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ ہر وقت یہ خیال دماغ میں سمایا رہتا ہے کہ شاید پھر کوئی عمدہ چانس مل جائے۔ پھر کامیابی نصیب ہو جائے اور لوگ دوبارہ اس کی پوجا کرنے لگیں۔

وہ اور پانچ برس تک فلمی دنیا کی خاک چھانتا رہا۔ پھر بڑھاپے نے کمر توڑ دی۔ آخر اس نے ایک پبلسٹی ایجنٹ انیل دت کے ہاں ملازمت حاصل کرلی۔ انیل دت کا ایک کاٹیج آبادی سے ذرا دور سمندر کے ساحل پر تھا۔ وہاں اور بھی عیاش دولت مندوں نے اپنے لئے کاٹیج بنا رکھے تھے۔ شیخو کاٹیج کے پچھواڑے ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور انیل دت کی پبلسٹی کے کاغذات سنبھال کر رکھتا تھا۔ وہاں کوئی دوسرا ملازم نہیں تھا۔ کیونکہ دوسرا ملازم رکھنے سے انیل دت کی پرائیویٹ زندگی میں خلل پڑتا تھا۔ اس کاٹیج میں وہ ہر شام پینے کے لئے بیٹھ جاتا تھا اور رات کو مدہوش ہو کر سو جاتا تھا کبھی کبھی وہ کسی جوان لڑکی کو ساتھ لاتا تھا۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ کاٹیج میں بوڑھے شیخو کے سوا کوئی نہ رہا کرے۔

شیخو کو وہاں دو باتیں زیادہ سوچنے پر مجبور کرتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ شاندار گاڑی میں بیٹھا ہوا انیل دت بہترین سوٹوں میں ملبوس اور نوٹوں سے لدا ہوا ایک جواں سال چھوکرا لگتا تھا۔ بمشکل پچیس برس کا جوان ہوگا۔ اس کم عمری میں اس نے وہ سب کچھ پالیا تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' اس کے روشن حال سے روشن تر مستقبل صاف جھلک رہا تھا۔

دوسری بات شیخو یہ سوچتا تھا کہ انیل دت اتنی کم عمری میں اتنی زیادہ شراب کیوں پیتا ہے اور نشہ میں ساری دنیا کو گالیاں دیتے دیتے ہوش سے بیگانہ کیوں ہو جاتا ہے۔ اسے کیا غم ہے؟ اس نشے کے پیچھے اسے کون غصہ دلاتا ہے؟

ایک رات وہ نشہ میں تھا۔ کوئی لڑکی ساتھ نہ تھی۔ ایسے وقت وہ شیخو کو سامنے بٹھا کر بکواس کرتا تھا۔ شیخو نے موقع پا کر پوچھا۔ "مالک! آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"پچیس برس۔"

"آپ فلمی دنیا میں کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"تقریباً پانچ برس سے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بیس برس کی عمر سے ہی عملی زندگی میں داخل ہو۔ اور اتنی جلدی اتنی ترقی کرلی؟"

اس نے شراب کا ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔ "ہاں.........."

شیخو نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "آپ کو فلمی دنیا کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود بڑے بڑے فلمساز اپنی کروڑوں روپے کی فلموں کی پبلسٹی آپ سے کراتے ہیں؟"

"بالکل۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میں خود پبلسٹی کی دردسری مول نہیں لیتا۔ میں زیاد منافع رکھ کر دوسرے ایجنٹوں کو ٹھیکہ دے دیتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح آپ کامیابی کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔"

وہ لاپروائی سے بولا۔ "یہ کامیابی کوئی اتنی قابلِ فخر نہیں ہے۔ میں ایک مہینہ میں صرف چالیس پچاس ہزار روپے کماتا ہوں۔"

"صرف؟" شیخو نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ انیل دت ماہانہ پچاس ہزار روپے کے منافع کے لئے "صرف" کا لفظ استعمال کر رہا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ وہ بہت کم عمر اور فلمی صنعت میں نو آموز تھا۔ جبکہ برسوں فلمی دنیا کی خاک چھاننے کے باوجود شیخو کے دل میں آیا کہ وہ پھر وہی چپراسی کا چپراسی ہی رہا۔

اس لمحہ بوڑھے شیخو کے دل میں ارادے جوان ہوئے کہ وہ پھر ڈائریکٹر بن سکتا ہے۔ آخر اس چھوکرے کی کامیابی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہے۔ نہ تو اس کی کھوپڑی میں کوئی افلاطونی دماغ تھا۔ نہ لکھنے کے معاملے میں اس کی املا تک درست تھی۔ نہ ہی اس کی شخصیت مقناطیسی تھی حتیٰ کہ وہ بہت زیادہ خوش شکل بھی نہ تھا۔ شیخو نے سوچا۔ "پھر یہ نوجوان اس قدر کامیاب کیسے ہے؟ کیا تقدیر پھر میرے لئے فلمی دنیا کے دروازے نہیں کھول سکتی؟ آہ میری کیسی ناقدری ہو رہی ہے۔ میں کل کے چھوکرے کا ملازم ہو کر زندگی گزار رہا ہوں۔"

انیل دت نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ جب میں پیتا رہتا ہوں تو اس وقت سوچنے والا آدمی مجھے اُلّو نظر آتا ہے۔ کچھ بولتے رہو۔"

شیخو نے پوچھا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ آپ کو کون سا غم کھائے جا رہا ہے؟"

"مجھے کوئی غم نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ اتنی زیادہ کیوں پیتے ہیں؟"

"یہ میری مرضی ہے۔"

"یہی تو بات ہے آدمی پہلے اپنی مرضی سے شراب پینا شروع کرتا ہے۔ پھر شراب پنی مرضی سے آدمی کو پیتے پیتے خالی کر دیتی ہے۔"

انیل دت نے گلاس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی پیتے پیتے ایک دن خالی ہو جانا پاہتا ہوں۔"

"کیا آپ کے دل میں یہ خوب صورت زندگی گزارتے رہنے کی خواہش نہیں وتی؟"

"خواہش؟" وہ تلخی سے بولا۔ "میری ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ میں ایک رام زادے کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

"قتل؟" شیخو نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ کسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

"اپنے باپ کو۔"

شیخو نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ نشے میں بک رہا ہو۔ بھلا کوئی بیٹا اپنے باپ کو قتل یوں کرے گا؟ انیل دت نے اس کے سامنے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے بڈھے! مجھے نشے میں سمجھنا میں پورے ہوش و حواس میں بھگوان کو گواہ رکھ کر.......... کہتا ہوں کہ جس دن ہرا باپ مجھے ملے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسی دن اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"آپ کا باپ کون ہے؟"

"یہی تو سالا معلوم نہیں ہے۔ پہلے میں وجے دت کو اپنا باپ سمجھتا رہا.........."

شیخو ایک دم سے ہڑبڑا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس مالک کو دیکھنے لگا۔ حقیقتاً اس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اسے بیٹا کہہ کر اس سے لپٹ جائے مگر ٹے کی شراب زدہ سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ابھی ابھی وہ گلا گھونٹنے کی بات کر رہا تھا۔

انیل دت کہہ رہا تھا۔ "ہاں میں اس سالے وجے دت کو اپنا باپ سمجھتا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھے اناتھ آشرم سے لایا گیا ہے۔ مجھے زبردست صدمہ ہوا۔ میں غصہ میں آ گھر سے نکل گیا۔ پھر ایک دن میں نے وجے دت سے اس اناتھ آشرم کا پتہ پوچھا۔ وجے دت نے مجھ سے پوچھا۔ "تم اناتھ آشرم کا پتہ پوچھ کر کیا کرو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں اس آشرم کے برسوں پہلے رجسٹر کھلوا کر معلوم کروں کہ میرے باپ اور ماں کون تھے۔"

وجے دت نے مجھ سے جھوٹ کہا کہ وہ آشرم بنارس میں ہے۔ میں نے کہا۔ "میں بنارس جاؤں گا۔ بہرحال میں اپنے اصلی ماں باپ تک ضرور پہنچوں گا۔"

میرا یہ عزم دیکھ کر وجے دت پریشان ہو گیا۔ اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی مگ میں ٹلنے والا نہ تھا۔ آخر اسے سچی بات بتانی پڑی.........."

"سچی بات؟" شیخو نے سہم کر تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ "اس نے آپ کو کون سچی بات بتائی۔ کیا آپ کے باپ کا نام بتا دیا؟"

انیل دت نے میز پر ایک گھونسہ مارا۔ شراب کی بوتل اور گلاس جھنجھنانے گئے پھ وہ بولا۔ "افسوس اس کا نام وجے دت کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

شیخو نے ذرا اطمینان کی سانس لے کر پوچھا۔ "پھر وجے دت نے کیا بتایا؟"

"اس نے بتایا کہ وہ اور اس کی بیوی بانجھ تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک کنوار لڑکی ماں بننے والی تھی۔ یعنی وہ میری ماں بن گئی۔ وجے دت کو اولاد کی ضرورت تھی اس نے میری کنواری ماں کی عزت رکھنے کے لیے مجھے گود لے لیا۔"

شیخو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہو سکتا ہے وجے دت نے جھوٹ کہا ہو۔ قصور آپ کے باپ کا نہیں ماں کا ہو۔"

"ماں کی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے مجھے نو ماہ تک پیٹ میں رکھا جس طرح میرا باپ عیاشی کر کے بھاگ گیا۔ اسی طرح میری ماں بھی مجھے پیدائش سے پہلے مار کر قصہ ختم کر سکتی تھی مگر اس نے میری جان نہیں لی۔ ہاں مجھے اس سے بھی نفرت ہے۔ کہ اس نے مجھے جنم دے کر کیوں چھوڑ دیا۔ اب میں ناجائز کہلاتا ہوں۔"

وہ گلاس اٹھا کر غٹاغٹ پینے لگا۔ شیخو اسے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ "میرا بیٹا کتنا بڑا آدمی بن گیا۔ اگر یہ مجھے معاف کر دے۔ ابا کہہ کر گلے لگا لے تو مجھے بھی یہ مہنگی شراب پینے

ملنے لگے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی دولت سے میں پھر ایک فلم شروع کر کے ڈائریکٹر بن جاؤں.........."

یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔ "بیٹے! مم میرا مطلب ہے۔ مالک! انسان پہلے غلطی کرتا ہے۔ بعد میں پچھتاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ آپ کے والدین اپنی غلطی پر بہت زیادہ پچھتا رہے ہوں۔"

"اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے جبکہ میں ناجائز کہلانے لگا ہوں۔"

"کون آپ کو ناجائز کہتا ہے؟"

"وجے دت کے پاس ایک فاحشہ آئی تھی۔ میں نے اس کی زبان سے اپنے لیے ناجائز والی گالی سنی۔ وہ بڑی منہ پھٹ تھی۔ پتہ نہیں اس نے مجھے کہاں کہاں بدنام کیا ہو گا۔"

شیخو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مالک! ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔ "کرو!"

"آپ کے وا۔ والد اب بوڑھے ہوں گے۔ اگر کبھی وہ خود آپ کے پاس آ کر معافی مانگیں گے تو آپ.........."

"تو میں معافی مانگنے سے پہلے ہی اس کی زبان کھینچ لوں گا۔ کیونکہ اسی زبان سے میری ماں کو گناہ کے لیے اکسایا ہو گا۔ میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ کیونکہ انہی میلی آنکھوں سے اس نے میری ماں کو دیکھا ہو گا۔ پھر میں اس کا گلا گھونٹ ڈالوں گا۔"

شیخو اندر ہی اندر کانپ گیا۔ آدمی کو بڑھاپے میں بھی زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بے موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب انیل دت نشے میں مدہوش ہو گیا تو شیخو بڑی مشکل سے اسے کھینچ کر بستر تک لایا پھر وہاں لٹا کر کاٹیج کے پچھلے حصے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا کہ بیٹے کی دولت اسے مل رہی ہے اور وہ پھر سے ڈائریکٹر بن رہا ہے۔

صبح وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گیا۔ اسے شبانہ کی یاد آئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ شبانہ اور وجے دت نے اگر انیل دت کو یہ بتا دیا کہ وہ اس کا اصلی باپ ہے تو پھر کیا ہو گا؟ انیل دت اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ایک بات شیخو کے حق میں بہتر تھی اور وہ یہ کہ شبانہ اور وجے دت اس کاٹیج میں

کبھی نہیں آتے تھے اور انیل ان لوگوں سے نہیں ملتا تھا لیکن یہ راز معلوم ہو گیا تھا انیل دت کی ترقی اور کامیابی کے پیچھے شبانہ اور وجے دت کی بھرپور سفارشیں کام کر رہی ہیں۔"

ایک زمانہ تھا جب شینو نے شبانہ کو بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ اب یہ زمانہ آیا تھا شبانہ اسے بلیک میل کر سکتی تھی۔ انیل دت کو بتا سکتی تھی کہ اس کا بدمعاش باپ کون ہے۔ ایک طرح سے اس کی زندگی اب شبانہ اور وجے دت کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ کبھی دونوں کا سامنا نہیں کرے گا اور نہ ہی یہ معلوم ہونے دے گا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاں ملازم ہے۔

ان دنوں جب کہ وہ شبانہ سے چھپ کر رہنے کے ارادے پر عمل کر رہا تھا۔ تب ہی اچانک شبانہ کی موت کی خبر ملی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ شام کے وقت سمندر میں تیز رفتاری سے موٹر بوٹ چلا رہی تھی۔ حسبِ معمول وہ کشتیوں کی دوڑ میں چوتھی مرتبہ انعام جیتنے کی تیاریاں کر رہی تھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ حادثہ کس طرح پیش آیا۔ کیونکہ چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔

بہرحال بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کشتی آگے جاتی ہوئی ایک دوسری کشتی سے بری طرح ٹکرائی۔ دوسری کشتی پر ایک بہت بڑے سیٹھ کا بیٹا کشور ناتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ٹکراؤ کی صورت میں دونوں کشتیاں پانی کی تہہ میں چلی گئیں۔ غوطہ خور تمام رات لاشیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح کشور ناتھ کی لاش خود بخود ساحل پر آ گئی۔ اس سے اگلے دن سمندر کی موجوں نے شبانہ کی لاش کو بھی ساحل کی طرف اچھال دیا۔

شبانہ کی لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ پولیس والے کئی دن تک اس کی شناخت میں لگے رہے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ لانبے بالوں والی تباہ حال اور شکستہ لاش شبانہ کی ہے۔ اخبارات کے لیے یہ ایک بہت بڑی خبر تھی۔ کیونکہ شبانہ نے فلمی دنیا میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اتنا طویل عرصہ کہ پچیس برس پہلے وہ شینو کے پاس چانس لینے کیسے پہنچی تھی۔ یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ فراموش کر دی گئی تھی۔ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ نہ ہی پچیس برس پہلے کے لوگوں نے یاد رکھا تھا۔ شبانہ نے پریم کمار سے جو عشق کیا تھا۔ وہ بھی ڈھکا چھپا ہوا تھا۔ شینو اور پریم کمار سے چرکہ لگنے کے بعد اس نے پھر کسی مرد کو لفٹ نہیں دی۔ کبھی شادی نہیں کی۔ ایسی زندگی گزارتی رہی کہ وہ فلمی دنیا کی پُراسرار

حسینہ کہلانے لگی۔

اس پُراسرار حسینہ کی موت کے بعد سوالات اٹھائے گئے کہ آخر شبانہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اس کا ماضی کیا تھا وہ کس طرح زندگی گزارتی تھی اور اس کی جوانی کس پر مہربان تھی اور کس پر نامہربان؟ اخبارات اور فلمی رسائل والے محض افواہوں اور اندازوں کے مطابق شبانہ کی داستانِ حیات پیش کرنے لگے۔ گزشتہ بیس برس کے ہر معروف اداکار سے لے کر اسٹوڈیوز کے چپراسیوں تک سے شبانہ کا ناطہ جوڑا گیا اور اس کی زندگی کا اصلی پہلا مرد شینو دم سادھے خاموش بیٹھا رہا۔ اگر وہ زبان کھولتا اور بات بڑھتی چلی جاتی تو اندیشہ تھا کہ انیل دت اسے باپ کی حیثیت سے پہچان کر مار ڈالتا۔

ایک شام انیل دت بہت خوش تھا۔ اس نے کاٹج میں آتے ہی شینو سے کہا۔ "بابا! بوتل اور گلاس نکالو۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں خوب پیوں گا۔"

"کیا بات ہے مالک! کیا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟"

"ہاں وہ فلم اسٹار شبانہ کی موت مجھے شہرت کی بلندی پر پہنچانے والی ہے۔"

شینو نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ایسے کہ شبانہ فلم "انگارے" میں کام کر رہی تھی۔ انگارے کا ڈائریکٹر وجے دت ہے اور پروڈیوسر لکشمی نارائن ہے۔ شبانہ نے پچھلے دنوں انگارے کا آخری منظر فلمبند کیا تھا۔ ایک کروڑ روپے مالیت کی یہ ٹیکنی کلر سپر سینما اسکوپ فلم جس میں شبانہ کے علاوہ تین نامور مشہور و معروف ہیروز نے کام کیا ہے' اس وقت لیبارٹری میں جا چکی ہے۔ سارے سیٹ توڑ دیے گئے ہیں اور ایسے ہی موقع پر شبانہ مر چکی ہے۔"

"تو پھر؟" شینو نے پوچھا۔

"یہ تو پھر یہ کہ پروڈیوسر لکشمی نارائن کے ایک کروڑ ڈوبنے والے ہیں۔ اگر لکشمی نارائن اس پوزیشن میں ہوتا کہ فوری طور پر فلم کو نمائش کے لیے پیش کر سکتا تو شبانہ کی موت کے باعث یہ فلم خوب رش لیتی کافی منافع حاصل ہوتا لیکن یہ اس سال کی سب سے زبردست فلم ہے۔ لکشمی نارائن نے دیوالی کے موقع پر اس کی نمائش کے انتظامات کیے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ رش لینے کے ساتھ اس فلم کو ایوارڈ کے مقابلہ کے لیے بھی پیش کیا جا سکے۔"

اس نے پہلا گلاس پینا شروع کیا۔ پھر کہا۔ "اب صورتِ حال یہ ہے کہ دیوالی تک

شبانہ کو مرے ہوئے چھ ماہ گزر چکے ہوں گے۔ اس کے متعلق فلم بینوں کا سارا جوش و خروش اور جذباتی وابستگی سرد پڑ چکی ہو گی۔ فلم دیکھنے والوں کے دماغوں سے شبانہ کا نام مٹنے لگے گا پھر بھولی بسری ہستی کے لیے کون دو چار روپے کے ٹکٹ خرید کر فلم دیکھے گا؟ یہ فلم محض شبانہ کی موت کے باعث بری طرح فلاپ ہونے والی ہے۔"

وہ دھمکی کا دوسرا گلاس بناتے ہوئے بولا۔ "لکشمی نارائن اب منافع کے متعلق کیا سوچے گا۔ اس نے جو ایک کروڑ روپے لگائے ہیں' وہی اسے واپس مل جائیں تو بڑی بات ہو گی۔ آج کل لکشمی نارائن کو مستقل سردرد کی شکایت ہے اور وہ اسپرین کے کئی ڈبے معدے میں اتار چکا ہے۔"

"لیکن مالک! یہ معاملہ اب آپ کو شہرت کی بلندیوں پر کیسے پہنچائے گا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے دو گھونٹ نگل کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ لکشمی نارائن کے تمام اہم افراد اس معاملے پر غور و خوض کر کے تھک چکے ہیں۔ انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کروڑ روپے یقینی طور پر ڈوبتے نظر آ رہے تھے۔ ٹھیک ایسے مرحلہ پر میں نے الجھی معاملے میں مداخلت کی۔ میں نے لکشمی نارائن کے سرمائے کو نہ صرف ڈوبنے سے بچانے کا حل پیش کیا ہے۔ بلکہ ریکارڈ توڑ منافع کمانے کا نسخہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔"

شیخو نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یعنی آپ نے اتنے پیچیدہ مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا ہے؟"

"بالکل۔ یہ میری ذہانت ہے۔"

"اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟"

"یہ ہے کہ اب میں شبانہ کی موت کو ایک نیا روپ دوں گا۔ وہ زندہ نہیں ہے مگر میں چھ ماہ تک اس کے تذکرے کو عوام میں زندہ رکھوں گا۔ میں اخبارات اور رسائل میں کچھ اس طرح بحث شروع کروں گا۔ "کیا شبانہ ابھی زندہ ہے؟" جس طرح اس ہیروئن کی زندگی پُراسرار رہی ہے' وہ پُراسرار حسینہ کہلاتی رہی ہے اسی طرح میں اس کی موت کو بھی پُراسرار بناؤں گا۔"

"لیکن اس کی لاش کو شناخت کر لیا گیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ماتا ہری کی لاش کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا اس کے

باوجود برسوں تک اس کے زندہ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتا رہا تھا۔"

اس نے تیسری بار گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ "میں چھ ماہ تک شبانہ کو زندہ رکھوں گا۔ ضروری ہوا تو اس کے نام سے ماہنامہ "پُراسرار شبانہ" شائع کروں گا۔ جگہ جگہ شبانہ کے پرستاروں کے کلب قائم کیے جائیں گے۔ ان کلبوں کی نام نہاد تقریبات اور بیانات کو پریس میں جگہ دلوائی جائے گی۔ ایک زنانہ رسالہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اس رسالے کا نام ہو گا .... "شبانہ" اس میں شبانہ کی زندگی کے بارے میں دردناک انکشافات کیے جائیں گے کہ روشنیوں کے دیس کی اس ہنستی مسکراتی شہزادی کے سینے میں درحقیقت کیسے کیسے دکھ کروٹیں لے رہے تھے اور اس نے ایک باحیا ہندوستانی لڑکی کی طرح کیسے ساری زندگی کنوارپنے میں گزار دی۔"

شیخو نے بے اختیار کہا۔ "وہ کنواری ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اس نے ایک بیٹے کو.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ غلطی کرتے کرتے سنبھل گیا۔ انیل دت نے دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ وہ نشہ میں تھا اور اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔ "یقیناً وہ کنواری نہیں ہو سکتی۔ مجھے معلوم ہے وہ چالیس سے اوپر عمر کی تھی لیکن ایسی حسین اور جوان نظر آتی تھی کہ ہندوستان کے کروڑوں تماشائی اس پر مرتے تھے۔ اس نے جس طرح خود کو حسین اور جوان بنائے رکھا تھا۔ اس سے ہمیں یہ سہولت حاصل ہو گی کہ ہم اسے کنواری دوشیزہ بنا کر پیش کر سکیں گے جیسے دس بچوں کی ماں بھی فلموں میں کنواری ہیروئن بنا کر پیش کی جاتی ہے۔"

اس نے چوتھی بار وہسکی کا گلاس بناتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لیے یہ بھی بڑی سہولت ہے کہ شبانہ کے متعلق کوئی بھی زیادہ نہیں جانتا ہے۔ ہم اس کے متعلق جس قسم کی داستان چاہیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ ایسے عنوانات سے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ "شبانہ کا اصل روپ" یا پھر یہ عنوان "شبانہ جسے کوئی نہ جان سکا۔"

شیخو نے سر ہلا کر کہا۔ "واقعی آپ کی منصوبہ بندی ایسی ہے کہ شبانہ مرنے کے بعد بھی برسوں عوام کے درمیان موضوع گفتگو بنی رہے گی۔ یعنی آپ اسے دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔"

شیخو کے دل کو ٹھیس پہنچی کہ شبانہ کو مرنے کے بعد نیک نامی ملے گی۔ وہ کنواری نہ

تھی۔ مگر پارسا کہلائے گی۔ وہ فلموں کی ایک ہیروئن تھی مگر اب اسے ہندوستان کی عظیم عورت سمجھا جائے اور یہ سب کچھ ایک بیٹا انجانے میں اپنی ماں کے لیے کر رہا تھا۔

انیل دت نے ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ''اخباروں اور رسالوں میں تقریباً ہر ہیروئن کی عشقیہ داستانیں شائع ہوتی ہیں لیکن میں شبانہ کے ماضی کی تحقیقات نہیں کراؤں گا۔ اپنی مرضی سے اس کا ماضی تخلیق کراؤں گا۔ میرے کرائے کے لکھنے والے اگر شبانہ کے عشق و محبت کا کوئی قصہ چھیڑیں گے تو وہ ہیر رانجھا اور سسی پنوں سے بڑھ کر افسانوی ہو گا۔ اس میں الف لیلوی عشق کا سوز' ایثار و قربانی کے انوکھے موڑ' محبت' دوستی اور رقابتوں کی عجب رنگ آمیزی اور پتہ نہیں کیا کیا ہو گا۔''

شیخو نے پوچھا۔ ''شبانہ کی زندگی میں آپ اس کے قریب تو رہے ہوں گے؟''

''یقیناً۔ اس کے کتنے ہی کاروباری معاملات میرے ہی ذریعہ طے ہوتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں وہ مجھ پر بہت زیادہ مہربان رہتی تھی۔''

''اس کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟''

''میں کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے ہر انسان سے نفرت کرتا رہوں اس دنیا میں سبھی خود غرض ہوتے ہیں ناجائز بچے پیدا کر کے چھوڑ دیتے ہیں پھر پلٹ کر ان کی خبر نہیں لیتے۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ایک گھونٹ پیا۔ پھر کہا۔ ''میں اس دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر محبت کو خیرات کے طور پر دینے کے لیے کہا جائے تو میں وہ خیرات شبانہ کو دوں گا۔ پتہ نہیں کیوں وہ مجھے کچھ اچھی لگتی تھی۔''

''شاید اس لیے کہ مہربان تھی۔ آپ کا زیادہ خیال رکھتی تھی۔''

''ہاں یہی ہو سکتا ہے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شبانہ کی لاش پر اپنی کامیابیوں کا محل تعمیر نہیں کرنا چاہیے۔ انسان ساری زندگی دنیا کی خباثت اور کمینگی کا سامنا کرتا رہتا ہے۔ کم از کم مرنے کے بعد تو اسے سکون کی ابدی نیند سونے دینا چاہیے۔ مُردوں کا کسی حد تک احترام ہونا چاہیے۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''خیال یہ ہے کہ ہم زندہ لوگ مُردوں کی بھی تجارت کرتے ہیں۔ اگر میں مُردہ شبانہ سے منافع حاصل نہیں کروں گا تو لکشمی نارائن کو میرے بدلے کوئی دوسرا مل جائے

گا۔ میں یہ موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا۔ سیٹھ لکشمی نارائن فلم انگارے کی ریلیز تک شبانہ کو زندہ رکھنے کے لیے پچیس لاکھ روپے خرچ کرے گا۔ اس میں سے دس لاکھ روپے کا منافع میں حاصل کروں گا۔''

شیخو نے حسرت سے سوچا۔ ''کاش اتنی رقم مجھے مل جاتی۔ میں ایک فلم شروع کر دیتا۔ پھر ایک بار ڈائریکٹر بن جاتا' کاش!''

☆======☆=====☆

انیل دت نے اپنے منصوبوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی خاطر خواہ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ پہلے پہل خبروں کی رم جھم شروع ہوئی۔ پھر یہ رم جھم موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اخباروں اور رسالوں میں خبروں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ پہلے ہی مہینے میں شبانہ نے ایک زندہ و تابندہ ہستی کی حیثیت حاصل کرنا شروع کی۔ دوسرے ماہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کے متعلق افسانوی قسم کے تحقیقی مقالوں اور فیچروں کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس کی یاد میں بیسیوں رسالوں اور اخباروں نے خصوصی نمبر نکالے۔ جگہ جگہ شبانہ کے پرستاروں کے کلب قائم ہو گئے۔ حتیٰ کہ ٹی وی والوں کی یہ حالت ہوئی کہ وہ شبانہ کی زندگی میں اس پر ریکارڈ کیے گئے پروگراموں کی پرانی پرانی ریلیں نکال کر چلانے پر مجبور ہو گئے۔

سب کچھ بالکل اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح انیل دت نے سوچا تھا۔ ہر طرف شبانہ کے چرچے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہر شخص شبانہ پر کچھ نہ کچھ لکھ رہا ہے۔ کوئی شبانہ کی سخاوت اور مہربان طبیعت پر مضمون نگاری کر رہا تھا۔ کوئی اس کے ساتھ اپنے نہایت ہی خصوصی قسم کے مراسم کے انکشافات میں مصروف تھا۔ کوئی ریڈیو اور ٹی وی پر انٹرویو دے رہا تھا کہ اس نے شبانہ کے ساتھ آخری دن کس طرح گزارے۔ ''کہیں مکاتیبِ شبانہ'' چھپ رہے تھے۔ کہیں اس کی عظمت اور انفرادیت پر مذاکرے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں شبانہ سے زیادہ شریف النفس' ذہین' پاکباز' باصلاحیت' کم عمر' نجیب الطرفین حسین اور ایثار پسند عورت نہیں گزری' جس نے اداکاری کا پیشہ اختیار کر کے بلاشبہ اس فن پر اور فلمی دنیا پر عظیم احسان کیا تھا۔ صرف تین ماہ کے اندر ہر ہندوستانی شبانہ کی زندگی کے ہر افسانوی پہلو سے واقف ہو چکا تھا۔

بلاشبہ شبانہ کی۔ ریکارڈ پبلسٹی کی گئی تھی۔ توقع سے زیادہ کامیاب نتائج سامنے آ رہے

تھے۔ ایسے ہی وقت انیل دت نے ایک اور زبردست دھاکہ کیا۔ اس نے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ ایک نئی بحث شروع کرائی۔ اس بحث کا عنوان تھا ”کیا شبانہ زندہ ہے؟“

بحث کے اہم نکتے یہ تھے کہ حادثہ ہوتے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ پھر یہ کہ وہ دونوں کشتیاں کہاں غائب ہو گئیں۔ جنہیں حادثہ پیش آیا تھا؟ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ساحل پر بہہ کر آنے والی کسی لاش کو شبانہ کیوں تسلیم کیا گیا؟ جب کہ لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ صرف وہ لانبے بالوں کی وجہ سے شبانہ نہیں ہو سکتی تھی۔ تمام اخباری مضامین کی تان یہاں آکر ٹوٹتی تھی کہ آخر ایسا کون سا ٹھوس ثبوت موجود ہے جس کی بنا پر شبانہ کو مُردہ تسلیم کرلیا جائے؟

بڑی ہنگامہ خیز اور قیامت جگانے والی پبلسٹی تھی۔ ان ہنگاموں کے ساتھ ساتھ ”انگارے“ کی نمائش کا وقت قریب آرہا تھا۔ ”انگارے“ وہ فلم اور لازوال فنکارہ کے فن کا آخری شہ پارہ تھی۔ آٹھ سال کے بچے سے لے کر اسی سال کے بوڑھوں تک کو ”انگارے“ کی نمائش والے دن کا اس طرح انتظار تھا جیسے اس دن آسمان سے پھولوں کی بارش ہونے والی ہو۔

☆======☆======☆

ساحل سمندر کی وہ رات بڑی تاریک تھی۔ چاند ذرا دیر سے طلوع ہونے والا تھا۔ کاٹج کے اندر برقی روشنی تھی۔ انیل دت فلمساز لکشمی نارائن کے دفتر سے لوٹا تو دیر ہو چکی تھی۔ وہ اندھیرا ہونے کے بعد اپنے ساحلی کاٹج میں پہنچا تھا۔ اس نے کامیابی کی خوشی میں لکشمی نارائن کے ساتھ تھوڑی سی پی تھی۔ اب کاٹج میں جشن منانے کا ارادہ تھا۔

اس نے آتے ہی شیخو سے کہا۔ ”بوتل اور گلاس نکالو۔“

شیخو نے اس کے آگے بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مالک! آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔“

وہ بوتل کھول کر پہلا پیگ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جو عزم کیا تھا اسے عملی طور پر دکھایا ہے۔ ہم اگلے ہفتے ”انگارے“ کو ملک گیر پیمانے پر ریلیز کر رہے ہیں۔ کیا سمجھے ملک گیر پیمانے پر۔ اخباروں میں کوئی پیشگی تبصرہ نہیں ہوا۔ ڈسٹری بیوٹر یعنی تقسیم کنندگان کو ایک ریل بھی چلا کر نہیں دکھائی گئی۔ اس کے باوجود پتہ ہے کیا عالم ہے؟ ڈسٹری بیوٹرز

اور سینما مالکان نوٹوں کی گڈیاں لیے دفتر پر ٹوٹ پڑے۔ فلمی دنیا کی تاریخ میں سب سے مہنگے نرخ پر فلم کی بکنگ ہو رہی ہے اور چیکوں کے بجائے سارا لین دین نقد ہو رہا ہے۔ دفتر میں فیکس اور ٹیلی گراموں کے انبار لگ گئے ہیں۔ ٹیلیفون سنتے سنتے لکشمی نارائن کا دماغ جواب دے گیا اور دولت سمیٹ کر رکھنے کے لیے اس کی تجوریاں چھوٹی پڑ گئی ہیں۔“

اس نے پینا شروع کیا پھر کہا۔ ”یہ سب کچھ کس کی بدولت ممکن ہوا۔ میری بدولت ....“ وہ ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو ٹھوکنے لگا۔ پھر اس نے حکم دیا۔ ”ایک اور گلاس لاؤ۔“

شیخو نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے ایک گلاس لاکر سامنے رکھا تو انیل دت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں تمہیں بھی پلاؤں گا۔“

اس نے گلاس بھر کر وہسکی شیخو کی طرف بڑھا دی۔ شیخو نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گلاس کو اٹھالیا۔ کوئی پانچ چھ سال بعد شراب نصیب ہو رہی تھی' وہ بھی بیٹے کے ہاتھ سے .... وہ گلاس کو منہ لگا کر ایک ہی سانس میں پینے لگا۔

انیل دت نے دوسرا گلاس شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”فلم انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ انقلاب میں نے برپا کیا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ میرے انمول ذہن کو خریدنے کے لیے بڑے بڑے فلمسازوں کے درمیان رسہ کشی شرع ہو گئی ہے۔ لکشمی نارائن نے دولت کی اس بارش میں سے ایک لاکھ روپے میرے لیے انعام کے طور پر رکھے ہیں۔ اس نے فوری طور پر میرے ساتھ پانچ سال کا معاہدہ کرلیا ہے۔ کوئی جوہری اپنے ہاتھ سے ہیرے کو گنوانا پسند نہیں کرتا اور یہ سب کچھ میرا حق ہے۔ اس مہم کے لیے میں نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔ ایسے مرحلوں پر کوئی میری راہ کی رکاوٹ بننا چاہتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔“

”قتل؟“ شیخو کا سر تھوڑا چکرانے لگا۔ کیونکہ بڑی مدت کے بعد اس نے پی تھی اور ایک ہی سانس میں پی تھی۔ شراب نے بوڑھے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ ”قتل؟ نہیں میں تمہارا باپ نہیں ہوں مجھے قتل نہ کرنا۔ میں بے گناہ بے ضرر بوڑھا ہوں۔“

انیل دت نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”بڈھے کو ایک ہی گلاس میں چڑھ گئی۔ سالا میری

شراب پی کر اپنے کو میرا باپ سمجھ رہا ہے۔ ابے میں نے کب تجھے باپ سمجھا ہے' ایں؟"
اس نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "سالے باپ بن جانا کون سی بڑی بات ہے۔ میں تمہیں پھر سے ڈائریکٹر بنا سکتا ہوں مگر تمہاری زندگی میں نہیں۔ کیونکہ زندگی میں ایک انسان دوسرے انسان کو کوئی مقام دینا نہیں چاہتا۔ شبانہ زندہ ہوتی تو آج دنیا والے اسے سر آنکھوں پر نہ بٹھاتے۔ اسے محض ایک اداکارہ سمجھ کر نظروں سے گرا دیتے۔ وہ مرنے کے بعد بھلا دی جاتی۔ مگر میں نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔ اس نے بھی مر کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو مجھے زبردست نقصان پہنچتا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو.........."

اس کی بات پوری ہوتے ہی کاٹیج کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سمندر سے چلنے والی تیز ہواؤں کا جھونکا اندر آیا۔ دونوں نے سر گھما کر دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ ہوا کی زد پر اڑنے والی چادر کو سنبھال رہی تھی۔ دونوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا۔ پھر یک زبان ہو کر کہا۔ "شبانہ!"

مگر وہ تو مر چکی تھی۔ انیل دت نے سنبھل کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہوں' جسے تم نے لافانی بنا دیا ہے۔ مجھے زبردست بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ کن انکھیوں سے شینخو کو دیکھ رہی تھی اور اس خیال سے شینخو کا دم نکل رہا تھا کہ شبانہ کہیں رشتہ ظاہر نہ کر دے۔ شبانہ سوچ رہی تھی کہ باپ بیٹے ایک جگہ کیسے آ گئے؟ اور یہ شینخو نوکر کی طرح فرش پر کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کیا دونوں ایک دوسرے کو باپ بیٹے کی حیثیت سے نہیں پہچانتے ہیں؟

انیل دت حیران اور پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "تم اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں؟"

"میں بمبئی سے ذرا دور گورے گاؤں کے ایک کاٹیج میں کچھ عرصہ سکون سے گزار رہی تھی۔ کیا مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟"

"ہاں ہاں بیٹھو مگر وہ حادثہ؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "حادثہ یوں ہوا کہ میری کشتی اس دوسری کشتی سے ٹکرا گئی تھی' جس میں وہ احمق کشور ناتھ سوار تھا اور بغیر لائٹ کے ہی کشتی لیے چلا

آ رہا تھا۔ وہ کشتی پر تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ لانبے بالوں والی ایک لڑکی بھی تھی' جو اس کی بیوی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی بازاری لڑکی تھی۔ کشور ناتھ نے اپنی شام رنگین بنانے کے لیے اسے ساتھ لے لیا ہو گا۔ کشتیوں کے اس تصادم میں کشور کے ساتھ درحقیقت وہی لڑکی ہلاک ہوئی ہو گی۔ ہو گی کیا یقیناً وہی ہلاک ہوئی تھی۔ بعد میں اسے میری لاش سمجھ لیا گیا۔ کیونکہ لاش کئی دن بعد ملی تھی اور اس کی حالت خراب تھی۔"

"اور تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"میں یہی بتانے لگی ہوں۔ ٹکر ہوئی تو میرے ہوش و حواس بھی جواب دے گئے۔ بہرحال مجھ میں اتنی سکت ضرور تھی کہ میں کشتی سے چمٹی رہی۔"

"لیکن کشتی تو ڈوب گئی تھی۔"

"نہیں میری کشتی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ ڈوبی نہیں تھی۔ ڈگمگاتی ہوئی میلوں دور ایک ویران ساحل پر پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے میں گورے گاؤں چلی گئی۔"

"تم بمبئی واپس کیوں نہیں آئیں؟"

"گورے گاؤں میں میرا ایک کاٹیج ہے۔ میں نے سوچا کچھ روز شہر کے ہنگاموں سے دور رہوں گی۔ پھر تیسرے دن میں نے اخبار میں اپنی موت کی خبر پڑھی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک لانبے بالوں والی لڑکی کی لاش کو مجھ سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا سنسنی خیز لگا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ چپ چاپ گورے گاؤں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھوں گی کہ میرے مرنے کے بعد دنیا والے میرا کیا تماشہ بناتے ہیں۔ ویسے تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔"

"تم کس رشتہ سے فخر کرو گی؟"

"ایں؟" انیل دت کے سوال پر شبانہ گڑبڑا گئی۔ اس نے شینخو کو دیکھا۔ شینخو اسے رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ رشتہ نہ بتائے۔ وہ بولی۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

انیل دت نے کہا۔ "تم بہت زیادہ پینے کی عادی ہو۔ بتاؤ کھانے سے پہلے کون سی شراب پیو گی؟"

شراب للچاتی ہے۔ شبانہ کے سامنے وہسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی مگر اس نے کہا۔
"نہیں کبھی انسانوں کے درمیان پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ میں تمہارے سامنے بھی نہیں

پیوں گی۔"

"کیوں نہیں پیو گی؟" ہمارے درمیان پاکیزگی کیوں ہونا چاہیے؟"

"اس لیے کہ میری عمر اتنی زیادہ اور تمہاری عمر اتنی کم ہے کہ عمر کے فاصلے کے حساب سے ہم ماں بیٹے بن سکتے ہیں۔ مجھے صرف کچھ کھلا دو۔"

شیخو نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "مالک! کیا میں کچن سے کھانا لے آؤں۔"

"ہاں لے آؤ۔"

وہ جانے لگا شبانہ نے کہا۔ "میں بھی کچن میں چلوں گی وہیں کھالوں گی۔"

انیل دت نے کہا۔ "ٹھیک ہے جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ میں کچھ سوچنا سمجھنا چا ہوں۔"

شبانہ شیخو کے ساتھ کچن میں آگئی۔ وہاں اس نے پوچھا۔ "کیا تم انیل کے ملاز ہو؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے لیکن میں نے آج تک رشتہ ظاہر نہیں کیا بھی نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اسے اپنے ناجائز ہونے کا زبردست صدمہ ہے۔ وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے ہماری تلاش میں ہے۔ کیونکہ ہم اس کی ناجائز پیدائش کے ذمہ دار ہیں۔"

"میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں تو تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

"انیل یقین نہیں کرے گا۔ وہ ہم دونوں کو گناہگار اور قابلِ گردن زدنی کہتا ہے او اپنے ہاتھوں سے ہمارا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہی چاہتا ہے۔ ہماری سزا یہی ہو سکتی ہے۔ تم یقیناً مرنے سے ڈرتے ہو۔ اسی لیے بیٹے کے قدموں میں ملازم کی طرح جی رہے ہو۔"

"ہاں زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی؟"

وہ بولی۔ "میں بیٹے کے ہاتھوں سزا پانے کے لیے تیار ہوں۔ جاؤ انیل کو جا کر بتا د کہ میں اس کی گناہگار ہوں۔"

"نن نہیں۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

"لیکن میں بتاؤں گی کہ تم اس کے بدمعاش باپ ہو۔"

"خدا کے لیے ایسا سنگین مذاق نہ کرو۔ ان ہانڈیوں میں سے اپنی پسند کا کھانا نکال کر کھالو۔"

"شیخو! ایک وقت تم مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔ آج میری باری ہے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کا ملازم بن کر رہے۔"

"میں ملازمت نہیں کروں گا۔ یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"سچ پوچھو تو میں اپنے بیٹے پر تمہارا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اپنے مفاد کی خاطر انیل کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

"نہیں میں کبھی ایسی ذلیل حرکت نہیں کروں گا۔"

"تم بلیک میلنگ کی ذلیل حرکت کر چکے ہو۔ میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ میں پچیس برس سے دور ہی دور رہ کر اس کی ترقی کے ذرائع پیدا کر رہی ہوں۔ اس کا تحفظ کر رہی ہوں۔ تمہارے جیسے آستین کے سانپ کو یہاں رہنے نہیں دوں گی یا تو تم یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ۔ یا بیٹے کے ہاتھوں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"نہیں میں چلا جاتا ہوں۔ انیل سے کچھ نہ کہنا۔ مم میں جا رہا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ کچن سے باہر چلا گیا۔ شبانہ ایک پلیٹ اٹھا کر ہانڈیوں سے اپنی پسند کا کھانا نکالنے لگی۔ شیخو نے سوچ لیا تھا کہ اسی وقت کاٹج کے پیچھے اپنی جھونپڑی میں جائے گا اور اپنا ضروری سامان ایک گٹھری میں باندھ کر پچھلے راستے سے چپ چاپ چلا جائے گا۔ انیل کو خبر بھی نہ ہو گی۔

لیکن کچن سے نکل کر اپنی جھونپڑی کی طرف جانے کے لیے اسے اس کمرے سے ہو کر جانا پڑا۔ جہاں انیل دت بیٹھا پی رہا تھا اور صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ اس نے شیخو کو جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں بوتل اٹھا کر وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

شیخو کی جھونپڑی میں مدھم سا بلب روشن تھا۔ وہ اندر آکر فوراً ہی اِدھر اُدھر سے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو جان نکل گئی۔ دروازے پر انیل دت ہاتھ میں بوتل لیے کھڑا تھا۔

اس نے جھونپڑی کے اندر آکر بوتل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو۔ اس بوتل کی ساری شراب پی جاؤ۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”نہیں مالک! میں زیادہ نہیں پیتا۔“

”میرا حکم ہے۔ اسے پی جاؤ۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ صورتِ حال سے کیسے نم
چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے زبردستی شیخو کے ہاتھوں میں بوتل تھما دی پھر ڈانٹ کر بولا۔ ”د
نہ کرو۔ پیتے چلے جاؤ۔“

وہ بوتل کو منہ سے لگا کر پینے لگا۔ انیل دت دیدے پھیلائے وحشیانہ انداز میں باچھیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے اسے پیتے دیکھ رہا تھا۔ دس منٹ میں بوتل خالی ہو گئی۔ شی
نے خالی بوتل کو چارپائی پر اچھال دیا۔ اب وہ اطمینان کی سانس لینا چاہتا تھا۔ اسی وقت انیل دت نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

شیخو تڑپ کر آزاد ہونا چاہتا تھا مگر وہ بوڑھا تھا اور انیل دت قد آور جوان تھا گردن پر اس کی گرفت بھی جوان تھی۔ وہ دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔ ”بڈھے! میں قاتل نہیں ہوں۔ میں صرف اپنے باپ کو مارنا چاہتا تھا مگر تو بدنصیب ہے کہ تیری گرد
میرے ہاتھوں میں آ گئی۔“

شیخو کے دیدے پھیل گئے۔ آخری لمحوں میں وہ پھیلے ہوئے دیدے پوچھ رہے تھے کہ جب باپ کا رشتہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر گلا کیوں گھونٹا جا رہا ہے۔ مگر وہ کوئی جواب پا
سے پہلے ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا جسم جھونپڑی کی دیوار سے لگ کر فرش کی طرف گرنے لگا۔ انیل دت نے اسے فرش پر چھوڑ دیا۔ ”پہلے میں شبانہ کو یہاں سے رخصت کر دوں پھر میں تمہاری لاش کو ٹھکانے لگاؤں گا۔“

اس نے باہر آ کر جھونپڑی کے دروازے کو بند کر دیا پھر اپنے کاٹیج میں آیا۔ اسی وقت شبانہ کھانے سے فارغ ہو کر اس کمرے میں آئی۔ انیل دت کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک ہفتہ بعد فلم انگارے ریلیز ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا۔ اس فلم کے پریس شو میں مجھ
حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ تم نے بڑی محنتوں سے مجھے زندہ رکھا ہے۔ آج تک مرنے کے بعد کسی کو ایسی زندگی نہیں ملی جیسی تم نے مجھے دی ہے۔ میں تم سے پوچھنے آئی ہوں کہ مجھے اب دنیا والوں کے سامنے آنا چاہیے یا نہیں؟“

اس نے آگے بڑھ کر شبانہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ باہر چل کر باتیں کریں۔ یہاں شراب کی گرمی اور گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔“

شبانہ نے اس کے ساتھ کاٹیج سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ بوڑھا ملازم کہاں ہے؟“

”وہ جھونپڑی میں اپنا سامان باندھ رہا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے چھٹی دیدی ہے۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ اس بوڑھے خبیث ڈائریکٹر کو میں برسوں سے جانتی ہوں۔ وہ کبھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود اسے ڈانٹ کر کہا تھا کہ وہ تمہارے کاٹیج سے چلا جائے۔“

”تم میری بھلائی کیوں چاہتی ہو؟ میں نے دیکھا ہے شروع سے تم مجھ پر مہربان ہو۔ آخر مجھ میں ایسی کیا بات ہے۔“

”تم بہت پیارے پیارے سے بچے ہو۔ وجے دت نے مجھے بتایا تھا کہ تم خطرناک ارادوں سے اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ انتقام کا جذبہ برا ہوتا ہے بیٹے!“

”مجھے بیٹا نہ کہو۔ مجھے اس رشتے سے نفرت ہے۔“

وہ چپ ہو کر سوچنے لگی۔ رات کی تاریکی چھٹ گئی تھی چاند نکل آیا تھا۔ وہ دونوں چاندنی میں راستہ دیکھتے ہوئے ایک اونچی ساحلی چٹان پر پہنچ گئے۔ چٹان کے آخری سرے پر گہری پستی میں سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔

شبانہ نے کہا۔ ”تمہاری ماں جو کوئی بھی ہو گی۔ اس نے بڑے درد سے تمہیں پیدا کیا ہو گا اور اب وہ جہاں بھی ہو گی، تمہارے لیے تڑپ رہی ہو گی۔ یہ سوچ سوچ کر مر رہی ہو گی کہ تمہارے لیے ایسا کرے کہ تم بہت ہی عظیم اور نیک نام بن جاؤ۔ انیل، دنیا کی کوئی ماں، ممتا کے عذاب سے نجات نہیں پاتی۔ آخری سانس تک اپنی اولاد کے لیے سوچتی اور مرتی رہتی ہے۔“

”تم ممتا کو کیا جانو۔ تم نے تو کبھی شادی بھی نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کیا ہو۔ مگر میں نے تمہیں اس دیس کی عظیم کنواری دوشیزہ بنا دیا۔ میں نے یہ بحث شرع کی تھی۔ ”کیا شبانہ زندہ ہے۔“ اس پر پولیس والوں کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں کہ میں گڑے مُردے نہ اکھاڑوں۔ کیونکہ پولیس والے بدنام ہوتے ہیں۔ ناچار میں نے اسی بات پر زور دیا کہ تم مُردہ ہو اور اب اگر زندہ ہو جاؤ گی تو میں ساری دنیا کے سامنے جھوٹا پڑ جاؤں گا۔“

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے۔ فلم ریلیز ہونے سے پہلے میں منظرِ عام پر آؤں گی تو وہ فلم اور زیادہ سپرہٹ ہو گی۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم ایشیائی باشندے مُردہ پرست ہیں۔ ہم انسان کو نہیں پتھر کو پوجتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے مندروں میں پتھر کی مورتیاں ہوتی ہیں۔ مہا کوی کالی داس اور غالب کو مرنے کے بعد پوجا گیا۔ رام کو زندگی میں بن باس کی سزا دی گئی۔ مرنے کے بعد اسی رام کو بھگوان کا اوتار مان لیا گیا۔ اگر تم یہ سوچتی کہ دنیا والے تمہاری زندگی کو خوش آمدید کہیں گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے چٹان کے سرے پر پہنچ گیا۔ شبانہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بولی۔ "تم اتنی دور کیوں آ گئے ہو؟ یہاں خطرہ ہے اُدھر چلو۔"

لیکن وہ اپنی دُھن میں بولتا جا رہا۔ "جب تم دنیا والوں کے سامنے آؤ گی تو پہلے بڑی حیرانی کا اظہار کیا جائے گا۔ پھر تمہیں ایسے دیکھا جائے گا جیسے تم دھوکے باز ہو کیونکہ تم نے چھ ماہ تک رُوپوش رہ کر دنیا کو دھوکہ دیا ہے۔ ان کے جذبات سے کھیلتی رہی ہو اور میں پبلسٹی ایجنٹ کی حیثیت سے تمہارا نام اچھالتا رہا ہوں۔ لوگ مجھے بھی جھوٹا اور فریبی کہیں گے۔ لہٰذا تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے شبانہ کے دونوں شانوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ چپ رہی اس کے ارادوں کو سمجھتے ہوئے بھی اپنی سلامتی کے لیے جدوجہد نہیں کی۔ نیچے سمندر کی گہری خطرناک لہریں جوار بھاٹا کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ وہ اسے اور سختی سے جکڑ کر بولا۔ "میں نے تمہاری خیالی موت کے بعد تمہیں لافانی بنا دیا ہے۔ اب تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ وہ بوڑھا تمہاری زندگی کا چشم دید گواہ تھا میں نے اسے بھی مار ڈالا ہے۔"

"میرے بچے! میں تو تم سے یہی پوچھنے آئی تھی کہ مجھے دنیا والوں کے سامنے آنا چاہیے یا رُوپوش رہنا چاہیے۔ میں تمہارے منصوبوں پر پانی نہیں پھیرنا چاہتی۔ اب تم چاہتے ہو کہ مجھے ہمیشہ کے لیے مر جانا چاہیے تو یہی سہی میرا بیٹا جس حال میں خوش رہے.........."

"مجھے بیٹا نہ کہو۔" یہ کہتے ہی اس نے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی چٹان کے سرے پر گئی۔ وہاں سے پستی میں چلی گئی۔ انیل دت نے آگے بڑھ کر ذرا جھک کر دیکھا۔ وہ اوپری چٹان پر سے گرنے کے بعد بھی سنبھل گئی تھی۔ نیچے دوسری چٹان کے سہارے

لٹک گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چٹان کے سرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ نیچے بھیانک لہریں گرج گرج کر اسے نگلنے آ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر بیٹے کو اوپری چٹان پر دیکھا۔ پھر کہا۔ "بیٹے! میں اب بھی اس چٹان پر چڑھ کر زندہ رہ سکتی ہوں مگر بہت ہو چکا۔ اب ممتا کا عذاب سہا نہیں جاتا۔ اپنے بیٹے کی اس بہت بڑی کامیابی پر ماں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتی ہے۔ جیتے رہو میرے لعل.........."

یہ کہتے ہی اس نے چٹان پر سے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ دوسرے ہی لمحہ سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں نے ایک ماں کو ممتا کے عذاب سے نجات دلا دی۔

☆========☆========☆

تار کانٹے

ایک جنگی قیدی کی اذیت ناک یادوں کی کہانی۔
انسان کو کچھ دینے اور کچھ لینے کی کہانی۔
دو بھائی، دونوں ایک ہی لڑکی کے امیدوار،
دونوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن جب وہ زمین بوس ہو گئی اور اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ اور اس کی سیاہ زلفیں نظر آئیں تب اسے پتہ چلا کہ اس نے ایک اچھی خاصی دوشیزہ کی مرمت کر دی ہے۔

وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے رخسار پر لہو کا ایک ننھا سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا گھونسہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچھے اچھے باکسروں کو سلا دیتا تھا۔ وہ پھول جیسی نازک لڑکی بھلا اس گھونسے کو کیسے برداشت کرتی؟ وہ مزاج پرسی کے لیے اس کے قریب جھکنا چاہتا تھا لیکن گھٹنے سخت ہو گئے تھے جھکنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ اعصابی کھنچاؤ تھا۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا، کر چکا تھا۔ اس کے دماغ پر جیسے دھند چھا گئی تھی۔

اس کے دل میں آیا کہ وہ اس حقیقت سے انکار کر دے کہ ایک معصوم لڑکی اس کا شکار ہو گئی ہے مگر تصوراتی تصویریں بدل جاتی ہیں، زندہ تصویریں نہیں بدلتیں۔ بڑی مشکل سے اس نے فٹ پاتھ پر اپنے گھٹنے اس کے قریب ٹیک دیئے، وہ بے ہوش لڑکی سے معذرت نہیں چاہ سکتا تھا، شاید محض ندامت سے جھک گیا تھا۔

تب اسے نعیم کی آواز سنائی دی، وہ اس کا بازو پکڑ کر کہہ رہا تھا۔ ”اعظم۔ اٹھو۔ بھاگو یہاں سے۔“

اس میں جیسے بھاگنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ نعیم اسے کھینچتا ہوا لے گیا، وہ جیسے بے خودی میں کھنچا جا رہا تھا۔ پھر کار کا دروازہ کھلا۔ نعیم نے اسے اندر دھکیل کر دروازے کو بند کیا۔ وہاں سے بھاگتا ہوا دوسری طرف سے اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے لمحے کار کا انجن غرایا، ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھی۔ اس جھٹکے سے اعظم سیٹ کی پشت سے ٹکرا کر آگے جھکا۔ پھر ذرا سنبھل گیا۔

وہ غیر شعوری طور پر بیٹھا تھا۔ ورنہ وہ دماغی طور پر حاضر نہیں تھا۔ وہ بے دھیانی

میں کار کی تیز رفتاری، انجن کا شور، راستے بدلتے اور موڑ کاٹتے وقت بریک کے چیخنے کی آوازیں سب کچھ سن رہا تھا، مگر ونڈ اسکرین کے پار سارے مناظر دھندلا گئے تھے۔ صرف وہ لڑکی فٹ پاتھ پر نظر آ رہی تھی۔

نعیم نے ڈرائیو کرنے کے دوران کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اسٹیئرنگ کے اِدھر سے اُدھر ہونے کے ساتھ ساتھ اعظم بھی کبھی دروازے کی طرف جھک رہا تھا کبھی نعیم سے ٹکرا رہا تھا جیسے کوئی لاش بیٹھی ہو اور اِدھر سے اُدھر ڈول رہی ہو۔ اس نے پوچھا۔ "ارے کیا تم زندہ ہو؟"

نعیم اپنے اس طنزیہ سوال پر خود ہی قہقہہ لگا کر بولا۔ "بس اب واپس آ جاؤ۔ پیچھے دیکھو کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے؟"

اعظم نے گھوم کر دیکھا جن گاڑیوں کو وہ اوورٹیک کر کے آگے بڑھتا جا رہا تھا صرف ان کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور ان روشنیوں میں اس لڑکی کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ مُردہ سی آواز میں بولا۔ "کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں ہے۔"

"پھر تم اتنے سہمے ہوئے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"تم نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

"بکواس مت کرو!" نعیم نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔

اعظم نے کہا۔ "تم میرے لیے ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت کھڑی کر دیتے ہو۔"

نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "غصہ تھوک دو۔ کوئی مصیبت ہمارے پیچھے نہیں ہے۔"

ایک موٹر گیراج کے پاس وہ کار آ کر رک گئی۔ اعظم کار سے اتر کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا گیراج کی دوسری منزل پر آیا۔ یہ ان کی رہائش گاہ تھی۔ ایک کمرے سے ریڈیو کے اسٹیشن بدلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کا ایک دوست اور بزنس پارٹنر سعید خان ریڈیو پر جھکا ہوا تھا اور اپنی پسند کی موسیقی تلاش کر رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سنتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا، پھر مسکرا کر پوچھا۔ "ہیلو اعظم! وہ تمہارا بھائی کہاں رہ گیا؟"

وہ ناگواری سے چلتا ہوا ایک ایزی چیئر پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر نعیم کمرے میں آیا۔ وہ سعید خان کے لیے ہیلو کے انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سعید خان خاموشی سے دونوں کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے اعظم! معاملہ

سنگین ہو گیا تھا کیا؟"

اعظم ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔ "ایسا کون سا معاملہ ہے جو نعیم کے ساتھ رہ کر سنگین نہیں ہوتا۔ میں اس کا ساتھ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

سعید خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم اور اپنے بھائی کو چھوڑ کر جاؤ گے، کیوں مذاق کرتے ہو؟"

"میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پہلے اس نے جس دکان سے چیز اٹھائی تھی، میں نے دوسرے دن اسے دکاندار کو واپس کر دیا تھا۔ آج اس نے ایک سنار کی دکان کا شوکیس توڑ دیا۔"

سعید خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "واقعی معاملہ سنگین ہے۔ تم بار بار چرایا ہوا مال واپس کرو گے تو نعیم پھر سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جائے گا۔"

اعظم پریشان ہو کر بولا۔ "مصیبت یہ ہے کہ اسے بچانے کے لیے میں کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتا ہوں۔ آج، آج میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔"

"ہائیں۔ تم نے بھی کچھ کیا ہے؟"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ "میں، میں کیا بتاؤں؟ میں سنار کی دکان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میرے بائیں طرف دکان کی دیواروں کے ساتھ مالتی کی جھاڑیاں تھیں۔ اس سے پرے فٹ پاتھ کا حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ جب نعیم نے شوکیس توڑا تب میں نے قدموں کی آواز سنی۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی آ کر اسے پکڑ لے۔ میں نے قریب آتی ہوئی آواز کا اندازہ کرتے ہوئے گھونسہ چلا دیا۔ ایک ہلکی سے کراہ سنائی دی۔ تب اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں مجھے پتہ چلا کہ میں نے ایک لڑکی پر حملہ کیا ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔"

سعید خان نے کہا۔ "بہت برا ہوا مگر کیا کیا جائے۔ نعیم کی حفاظت کے لیے تم برے وقت سے گزرتے ہی رہتے ہو۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔"

اعظم نے دانت پر دانت جما لیے۔ وہ بڑے بڑے حادثوں کو بھول جاتا تھا مگر وہ لڑکی اس کے ذہن سے محو نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس کے آگے فٹ پاتھ بچھی ہوئی تھی۔ وہ ساری یادوں کو بھلا سکتا تھا مگر اس کے تصور کو نہیں مٹا سکتا تھا۔

سعید خان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں نے پہلے ہی اسے خطرے سے آگاہ کیا

تھا۔ یاد ہے آج دوپہر کو میں نے تم سے کہا تھا کہ نعیم پر دورہ پڑنے والا ہے۔ ہو سکے تو فوراً ہی اس کے دماغ سے غبار کو نکال دو۔"

"ہاں تم نے کہا تھا۔ مگر یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ تمہاری اطلاع درست ہو جائے۔ میں نے سوچا تم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

اعظم نے دو انگلیوں سے اپنی پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا۔ "میں جتنا اس کی ذہنی حالت کو سمجھنا چاہتا ہوں شاید اتنی ہی میری کم فہمی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"یہ کم فہمی کی بات نہیں ہے اس کا سیدھا سا علاج ہے جب بھی اس کے رویے میں تبدیلی آئے فوراً ہی اس کے دماغ سے سارا غبار نکال دیا جائے۔"

اعظم اپنے بالوں پر انگلیاں پھیرنے لگا اور سوچنے لگا۔ شاید اب میرے دماغ میں بھی غبار بھرتا جا رہا ہے۔ وہ میرے دل و دماغ میں لہو کی طرح رینگ رہی ہے۔ "آہ میں نے کیا کیا۔ کیا وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر پڑی ہو گی۔ کیا مجھے وہاں جا کر دیکھنا چاہیے؟" اس نے سر کو جھٹک کر سوچا۔ "نہیں یہ حماقت ہو گی' وہاں لوگوں کی بھیڑ ہو گی۔ اسے فوری طبی امداد پہنچائی گئی ہو گی اور پولیس والے میری بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اس کے لیے میری ہمدردی حماقت بن جائے گی۔"

اس نے تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس کا کیا علاج ہو سکتا تھا کہ بند آنکھوں کے پیچھے وہ ہی وہ نظر آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

صبح وہ منہ اندھیرے بستر پر سے اٹھ بیٹھا حالانکہ کہ اتنی جلدی اٹھنے کا عادی نہ تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید رات بھر سونے کے دوران بھی بے چین رہا تھا' کوئی اس کی نیند کو بار بار نوچ لیتا تھا یا شاید لیتی تھی۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا' کپڑے پہنے' پھر کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر ابھی اندھیرا تھا۔ دور تک راستے پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ راستوں پر چلنے لگا۔ کیوں چل رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا' وہ خود نہیں جانتا تھا۔ ایک گلی سے گزر کر دوسری گلی میں پہنچ رہا تھا کبھی دائیں کو مڑ رہا تھا اور کبھی بائیں۔ اس دوران وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں سوچے گا اور کچھ نہ سوچنے والی بات سوچ رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کب تک اِدھر سے اُدھر بھٹکتا رہا۔ رات کا چہرہ آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا۔

سڑکیں اور گلیاں راہ گیروں سے آباد ہونے لگیں۔ تب وہ اخباروں کے ہاکر کے پاس پہنچا۔ ہاکر کے سامنے ایک اٹھنی پھینک کر اس نے ایک اخبار اٹھایا۔ پھر اس پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ قریب ہی ایک چائے خانہ تھا۔ اس نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ پھر سارے اخبار کے ایک ایک کالم کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اسی وقت اس کی نظر ایک چھوٹی سی سرخی پر پڑی۔ لکھا تھا "لڑکی پر حملہ" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بڑی مختصر سی خبر تھی کہ ایک سنار کی دکان کے سامنے چوروں نے ایک لڑکی پر حملہ کیا تھا۔ چوروں کا ذکر اس لیے تھا کہ سنار کا شوکیس توڑا گیا تھا مگر جو کچھ وہ چاہتا تھا' وہ خبر وہاں نہ تھی۔ لڑکی کا نام نہیں تھا۔ اس کے متعلق ذرا سی بھی تفصیل نہیں تھی۔

اس نے ابھی تک چائے کی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا' اس کا دھیان کہیں اور لگا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ چائے والے نے آواز دی مگر وہ بھاگا ہوا اخبار فروش کے پاس آیا اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولا۔ "آج کے تمام اخبارات مجھے دے دو۔"

پھر وہ خود جلدی جلدی اخبارات سمیٹ کر باقی رقم لے کر چائے خانے میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور ایک ایک کر کے تمام اخبارات کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کی مطلوبہ خبر کہیں نہیں تھی۔ پچھلی رات کا واقعہ تھا۔ صبح اتنی جلدی تفصیلی خبر شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی تو پولیس والے تحقیقات کر رہے ہوں گے۔ وہ مایوس ہو کر چائے پینے لگا۔

پینے کے دوران پھر اس کے دماغ میں کیڑا کلبلایا۔ جس اخبار میں وہ مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی۔ اسے لپیٹ کر چائے کے پیسے ادا کیے پھر تیزی سے سڑک کو پار کرتا ہوا ایک ٹیلی فون بوتھ کے اندر پہنچ گیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا سکے ڈالے' پھر اس اخبار کے فون کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آواز سنائی دی۔ "ہیلو"

اعظم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہیلو......... دیکھیے آپ کے اخبار میں ایک لڑکی کے متعلق خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک سنار کی دکان کے پاس اس بیچاری پر کسی نے حملہ کیا ہے۔ کیا آپ اس کی تفصیلات بتا سکتے ہیں؟"

"ذرا ایک منٹ۔" اس آواز کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔ وہ ذرا ایک منٹ کے لیے انتظار کرنے لگا۔ پھر دوسری آواز نے پوچھا۔

"فرمائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں اس لڑکی کا نام اور پتہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"ذرا ایک منٹ انتظار کریں ہم ابھی بتاتے ہیں۔"

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہونے والا تھا۔ اس نے ریسیور کو کان سے چپکا لیا جیسے معلومات کو دبوچ رہا ہو۔ ایک منٹ گزر گیا دو منٹ گزر گئے' تیسرے منٹ میں اسے اپنے اندر سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے کوئی پیچھے سے آ کر اس کا گریبان پکڑ رہا ہو۔ اس کے دماغ نے چیخ کر کہا۔ "خطرہ......... وہ لوگ مجھے یہاں روک کر پولیس والوں کو خبر کریں گے۔ کسی طرح معلوم کریں گے کہ میں کس بوتھ سے بول رہا ہوں۔"

اس نے فوراً ہی ریسیور کو ہک سے لٹکا دیا۔ پھر تیزی سے باہر نکلا۔ کشادہ سڑک پر دونوں طرف سے کاریں آ جا رہی تھیں۔ پتہ نہیں پکڑنے والے کہاں سے آ جاتے۔ وہ اس سڑک سے دور بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ پھر وہی ایک گلی سے دوسری گلی کا سفر شروع ہو گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے انداز میں چل رہا تھا۔ بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ بدحواسی میں بھاگتے اور چلتے رہنے کے بعد ایک دیوار سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ جب خطرے کا احساس مٹ گیا تو اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس کے کش لگانے کے بعد ذرا سکون محسوس ہوا۔ پھر وہی دماغ جس نے خطرے کی دھمکی دی تھی' اب سکون سے کہہ رہا تھا۔ "خواہ مخواہ بھاگ آیا' تھوڑا اور انتظار کر لیتا تو اس کا نام اور پتہ معلوم ہو جاتا۔ میرے دل کا چور مجھے یہاں تک بھگا کر لے آیا۔"

وہ تھک ہار کر اپنے گیراج کے پاس آیا۔ گیراج کھل گیا تھا اور ان کے دو ملازم لڑکے گاڑیوں کے مختلف پارٹس کی صفائی کر رہے تھے۔ نعیم اور سعید خان ابھی تک گیراج کا کام سنبھالنے نہیں آئے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جانے لگا۔

اوپر پہنچتے ہی نعیم اور سعید خان کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کسی بات پر جھگڑ رہے تھے اسی وقت سعید خان تیزی سے چلتا ہوا اوپری برآمدے میں آیا۔ پھر اعظم کو دیکھ کر ٹھٹک گیا' وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اعظم کو دیکھ کر پریشانی سے بولا۔ "ابھی اس کا غبار باقی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

سعید خان نے سر گھما کر اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ ابھی نکل کر آیا تھا۔

پھر اس نے کہا۔ "اگر تم کل رات ہی اس کا غبار نکال دیتے تو سنار کے ہاں چوری اور لڑکی کے ساتھ سینہ زوری کی نوبت نہ آتی۔ اندر جا کر اپنے بھائی کو دیکھو۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ابھی تک اندر ہی اندر ابل رہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا نیچے گیراج کی طرف چلا گیا۔ اعظم نے پریشان ہونے کے انداز میں ایک گہری سانس لی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا نعیم کے کمرے میں پہنچ گیا۔ نعیم کمرے کے اندر ایک اخبار کا بڑا سا گولہ بنا کر اسے چھت کی طرف اچھال رہا تھا۔ اچھال رہا تھا اور کیچ کر رہا تھا۔ اعظم نے پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے نعیم؟"

نعیم نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ دیکھنے کا انداز عجیب تھا۔ یعنی آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اعظم سمجھ گیا کہ اس کے اندر دھواں بھر رہا ہے۔ اگر اس دھوئیں کو اس کے اندر سے خارج نہ کیا گیا تو یہ پھر کوئی واردات کرے گا۔ وہ نعیم کے ذرا قریب آ کر بولا۔ "میں تمہیں طرح دے جاتا ہوں۔ کل رات بھی میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ سنار کی دکان سے کیا اٹھا کر لائے ہو؟"

نعیم جواب دینے کے بجائے پھر اخبار کے گولے کو اچھالنے لگا۔ اعظم نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "تم ذلیل ہو......... کمینے ہو۔"

اعظم کا خیال تھا کہ گالیاں سن کر غصہ آئے گا مگر وہ گولے کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اعظم نے پریشان ہو کر سوچا۔ اوہ' گیارہ ہفتے پہلے اس نے واردات کی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کے دماغ سے غبار نکال دیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غبار نکلتا جائے تو پھر ایک طویل مدت کے بعد اس پر دورہ پڑتا ہے اگر آج کا غبار نکل جائے تو کچھ عرصے کے لیے اس کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔

یہ سوچتے ہی اس نے نعیم کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ ایک معمولی سا حملہ تھا۔ نعیم مار کھا کر یوں سر کو جھٹکنے لگا جیسے کوئی کتا پانی سے نکلنے کے بعد پانی کو جھاڑنے کے لیے سر کو جھٹکا دیتا ہے۔ مگر اس نے جوابی حملہ نہیں کیا۔ وارننگ دینے والی نگاہوں سے اسے دیکھ کر پھر گولے کو اچھالنے لگا۔ اس بار اعظم نے اس کی ناک کے قریب ایک گھونسہ رسید کیا۔ نعیم لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ اوپر سے واپس آنے والے گولے کو کیچ نہ کر سکا۔ تب اس نے غرا کر نیچے گرے ہوئے گولے کو دیکھا جیسے وہ گولا اس کی اہم ضرورت ہوا اور اس سے چھین لیا گیا ہو۔

تب نعیم ایک دم سے ساکت ہو کر جیسے دور ماضی میں پہنچ گیا۔ دور بہت پہلے جب وہ جنگی قیدی تھا' اس کے چاروں طرف تار کانٹوں کی دیواریں تھیں۔ جب اسے کھانا دیا جاتا تو وہ کھانا تار کانٹے سے دور رکھ کر اس سے کہا جاتا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے کھانے تک پہنچ جائے۔ جب وہ ہاتھ بڑھاتا تو تار کانٹے اسے روکتے۔ وہ اپنے ہاتھ کو کھانے تک پہنچانے کے لیے آگے کی طرف جھکتا تو وہ تار کانٹے اس چبھنے لگتے۔ دشمنوں کے مسلح سپاہی اس کی حالت پر قہقہے لگاتے تھے۔

دشمن فوجیوں نے اسے گرفتار کرنے کے بعد بہت زیادہ ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ایسی اذیتیں جنہیں انسان برداشت کرتے کرتے جنونی بن جاتا ہے۔ وہ آدمی رہتا ہے مگر اپنی آدمیت کے پیچھے کبھی کبھی کسی کتے کی طرح بھونکنا اور کاٹنا چاہتا ہے۔

جب وہ رہا ہو کر آیا تو ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ دماغی امراض کے ماہروں نے اس کا علاج کیا تھا۔ جب وہ نارمل ثابت ہونے لگا تو اعظم اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ بے شک وہ نارمل تھا مگر کبھی کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے وہ تار کانٹے آتے تھے اور اس کے دماغ میں چبھتے تھے۔ ویسے وہ صحیح الدماغ رہتا تھا لیکن جب اس کی خواہش کے آگے کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تو اچانک ہی وہ تار کانٹے دکھائی دینے لگتے اور وہ ضد میں آ جاتا تھا کہ اپنے کھانے تک .... اپنی ضرورت تک .... اپنی خواہش تک ضرور پہنچے گا۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

جب وہ کاغذ کا گولا اس کے ہاتھ میں نہیں آیا' اور فرش پر گر پڑا' تب اچانک ہی وہ تار کانٹے نگاہوں کے سامنے اُبھر آئے۔ اس گولے تک پہنچنے کے درمیان اعظم آ گیا تھا۔ اس نے اچانک ہی اس تار کانٹے کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔ اعظم لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے گیا۔ نعیم نے تار کانٹے کے سینے پر دوسرا گھونسہ' پھر اس کے ٹھوڑی پر تیسرا گھونسہ رسید کیا۔ اعظم مار کھاتا ہوا پچھلی دیوار سے جا کر لگ گیا۔

اعظم کے منہ سے ایک کراہ نکلی جیسے مار کھا کر مزہ آ گیا ہو۔ اس کے سامنے کوئی بچہ نہیں تھا۔ ایک سابقہ فوجی تھا اور اس کے حملے فوجی دھماکے کرتے تھے۔ اگر اعظم اپنی چوٹوں اور تکلیفوں کا خیال کرتا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ ابھی پوری طرح ابال میں نہیں آیا ہے' اسے ذرا اور ابالنا ہو گا!"

یہ سوچتے ہی اس نے نعیم پر جوابی حملہ کیا۔ جواب میں وہ اور زیادہ بھڑک گیا۔ اس

نے اعظم پر پے در پے گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ بڑا زبردست حملہ تھا۔ برداشت کرنے کے باوجود اعظم کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ اس کے باوجود وہ برداشت کر رہا تھا۔ "مجھے برداشت کرنا ہو گا۔ اگر یہ غبار یہاں نہ نکلا تو باہر کسی پر نکلے گا۔ باہر یہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا رہے گا تو رفتہ رفتہ یہ بات پھیل جائے گی کہ میں نے ایسے نیم پاگل بھائی کو پناہ دے رکھی ہے جو شریف شہریوں کے لیے خطرہ بنتا رہتا ہے۔"

وہ مار کھانے کے بعد فرش پر سے اٹھنے لگا۔ نعیم نے اس کے سینے پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ الٹ کر کرسی پر پہنچ گیا۔ نعیم کے دماغ میں صرف ایک ہی بات تھی کہ وہ تار کانٹا ٹوٹ جائے۔ ایسا بے بس ہو جائے کہ راستے کی دیوار نہ بنے۔ اس نے اعظم کے سر کے بالوں کو پکڑ کر کھینچا۔ پھر اس کے پیٹ میں ایک گھونسہ رسید کیا۔ اعظم کی جیسے سانس رکنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ ذرا سنبھلتا' اس کی آنکھ کے پاس دوسرا گھونسہ لگا۔ دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ اب سنبھلنے کی فرصت نہ ملی۔ پے در پے گھونسوں کے بعد ایک آخری زبردست گھونسہ ناک پر پڑا۔ وہ تیورا کر گر پڑا۔ ایک دم سے دنیا اندھیر ہو گئی' اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟

نعیم کی آنکھیں چمکنے لگیں' جیسے تار کانٹے کی دیوار ہٹ گئی ہو۔ اس نے ناک اور منہ سے گہری سانس چھوڑی' پھر اطمینان سے کاغذ کے گولے کو اٹھا کر اچھالنے اور کیچ کرنے لگا۔

☆======☆======☆

سعید خان اسے ہوش میں لایا تھا۔ اس کی بے ہوشی تھوڑی دیر کی تھی ہوش میں آیا تو اس کی ناک اور جبڑے دکھ رہے تھے۔ ظاہری طور پر کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "نعیم کہاں ہے؟"

"اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بڑی موج میں آ کر نیچے گیراج میں کام کر رہا ہے۔"

اعظم نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے' ویسے تم تماشہ دیکھ رہے تھے؟"

سعید خان نے بے بسی سے کہا۔ "بھئی میں ایک سیدھا سادا کاروباری آدمی ہوں' تم دونوں کی طرح پہلوان نہیں ہوں۔ بھئی خوب فری اسٹائل ہوتی ہے۔" پھر اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "خدا بچائے........."

وہ دن گزر گیا۔ دوسری رات آئی' ہر رات کی طرح وہ بھی گزر گئی مگر ایک اعظم سمجھتا تھا کہ اب راتیں کتنے کرب سے گزرتی ہیں۔ ایک مصور تھا جو اسے بار بار بلاتا تھا۔ ایک تصویر تھی جو اس کی جاگتی آنکھوں کی پتلیوں میں نقش ہو گئی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیوں اس کے متعلق نہ چاہتے ہوئے بھی سوچتا رہتا ہے۔

کیا اس لیے کہ لڑکی پر ہونے والی زیادتی اسے شرمندہ کر رہی تھی؟ یا اس لیے کہ وہ بے ہوش ہونے والا حسن اس کے دل پر اثر کر رہا تھا؟ وہ دوسری صبح بھی منہ اندھیرے اٹھ کر گھر سے نکل گیا۔ وہی سوالات اس کا پیچھا کر رہے تھے اور جواب یہ تھا کہ زیادتی تو اس نے پہلے بھی دوسروں سے کی تھی۔ نعیم کی وجہ سے کبھی وہ کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا تھا اور دوست بناتا تھا۔ جو دوست نہ بن سکتے اور اکڑ دکھاتے تو ان کی مرمت کر دیتا تھا۔ زیادتی تو اس نے پہلے بھی کئی بار کی تھی۔

البتہ کسی لڑکی پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔ کچھ یہی بات تھی اور کچھ وہ بات تھی کہ شاعروں کو حسن خوابیدہ اچھا لگتا ہے اور اس کے دل میں حسن کی بے ہوشی نے گھر کر لیا تھا۔ خیالات کے ہجوم میں بھٹکتے بھٹکتے صبح کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے اخبار خرید کر اس کی ورق گردانی شروع کی۔ کہتے ہیں تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں وہ بھی مل گئی۔

اس کا نام مونا رحمٰن تھا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ بفرزون کے علاقے میں ساتویں گلی کے ساتویں مکان میں رہتی تھی اور کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ اعظم جیسے خوشی سے پھٹ پڑنے کو تھا۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کسی کی پیٹھ پر ایک زور کی دھپ لگائی۔ جس بیچارے کی پیٹھ پر قیامت ٹوٹی' وہ اخبار کے ڈھیر پر اوندھا ہو گیا۔ اخبار فروش نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

اعظم کو ہوش آیا۔ مار کھانے والا غصہ میں جھنجلا کر اٹھ رہا تھا۔ اعظم نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "معاف کرنا بھائی! ابھی یہاں میرا ایک ساتھی کھڑا ہوا تھا' میں سمجھا وہی ہے۔" پھر وہ سامنے والے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے چائے خانے کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ "غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ شاید ایسی نہ ہوتی ہو گی جیسے مجھ سے ہو گئی۔ مگر آج یہ ثابت ہو گیا کہ ایسی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔ "آؤ میں تمہیں گرما گرم چائے پلاؤں گا۔"

مار کھانے والا حیران اور پریشان اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "صرف چائے سے کیا ہو گا' مجھے بھوک لگی ہے۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔"

تب اعظم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا کوئی مفلوک الحال شخص تھا' اسے کچھ دے دلا کر اپنی طرف سے ہونے والی زیادتی کی تلافی کی جا سکتی تھی۔ اس نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ عید مناؤ' آج میرے لیے عید کا دن ہے۔"

پھر وہ کوئی جواب سنے بغیر اس کے پاس سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ پہلے اس نے سوچا کہ بس میں بیٹھ کر اپنے گیراج تک جائے' پھر وہاں سے کوئی گاڑی لے کر بفرزون تک جائے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ صورت دھیمی دھیمی سی لو دے رہی تھی۔ جی چاہتا تھا پَر لگا کر وہاں پہنچ جائے۔ پھر عقل آئی کہ اتنی صبح وہاں سناٹا ہو گیا۔ شاید وہ سو رہی ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مار کھانے کے بعد وہ ہسپتال میں پڑی ہو۔ شاید ابھی تک زخمی ہو۔

اس کے ساتھ جو ایک انجانا سا لگاؤ تھا' اس لگاوٹ نے زخمی ہو کر اعظم کو بھی زخمی کیا۔ وہ شرمندہ ہو کر جلدی سے ایک بس پر سوار ہو گیا۔ کنڈیکٹر بس کی باڈی پر ہاتھ مار مار کر مسافروں کو پکار رہا تھا۔ "صدر' سوسائٹی' کلب روڈ' بفرزون۔ آؤ' آؤ.........."

اعظم کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کنڈیکٹر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو مونا رحمان کے پاس چلنے کی دعوت دے رہا ہے۔ جیسے آج ساری دنیا کے سارے مسافروں کی منزل مونا رحمان ہے اور اگر مونا رحمان نہیں ہے تو یہ دنیا بھی نہیں ہے۔ وہ عجیب الٹے سیدھے خیالات کی رَو میں بہہ رہا تھا۔ یہ اچھا ہی ہے' خیالات کی رَو میں پتہ نہیں چلتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ منزل پر پہنچ کر وہ چونکا۔ بس سے اتر کر ساتویں گلی تلاش کی۔ ہر مکان کے دروازے پر نمبر واضح طور سے نظر آ رہے تھے۔ سات نمبر بھی نظر آ گیا۔

سات نمبر کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسکول میں پڑھانے والی صبح اٹھ جاتی ہو گی۔ وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی کام سے باہر آئے گی اور اگر باہر آئے گی تو وہ کیا کرے گا؟

وہ سر کھجا کر سوچنے لگا۔ اس نے تو پہلے سوچا ہی نہیں تھا کہ جسے اتنی شدت سے تلاش کر رہا ہے' وہ مل جائے گی تو اس کی صورت دیکھ کر کیا کہے گا؟ کیا اس سے معافی مانگے

گا؟ وہ حیرانی سے پوچھے گی کہ کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟ کیا وہ اعتراف کر سکے گا کہ اس پر ہاتھ اٹھانے والا بدمعاش وہی ہے؟ نہیں.......... وہ تو مجرم کو سامنے دیکھتے ہی چیخنے چلانے لگے گی۔ محلے والوں سے پٹائی کرائے گی۔ پھر یہاں سے وہ حوالات میں پہنچ جائے گا۔

وہ کبھی اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا کہ بس وہ اسے ہمدردی سے دیکھنے آیا ہے۔ جیسے اپنوں کی بیماری میں عیادت کرتے ہیں' اسی طرح وہ دور ہی دور سے اسے دعائیہ نظروں سے دیکھے گا۔ پھر چلا جائے گا۔ وہ سوچتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے سوچا کہ وہ تھوڑی سی جگہ پر ٹہلتا رہے گا تو محلے والوں کی نظروں میں مشتبہ ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آہستہ آہستہ آنے جانے لگا۔ اس مکان سے دور جاتے وقت وہ بار بار پلٹ کر اسے دیکھ لیتا تھا۔ اس کا دل اس سے کہتا تھا۔ "وہ دیکھو' وہ آ گئی.......... اچھا نہیں آئی .... چلو اب دیکھو.......... اب آ گئی ہے۔"

مگر وہ باہر نہیں آئی۔ ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے کہ پاؤں میں مہندی لگا رکھی ہے۔ ایسے وقت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نصیب دیر سے جاگتے ہیں۔ اس کے دماغ میں ایک بات آئی کہ اخبار والوں سے پتہ شائع کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ پونے دس بجے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک دم سے یاد آیا کہ آج جمعہ کا دن ہے' اسکول تو بند ہو گا' وہ باہر کر کیا کرے گی؟

وہ تھک ہار کر واپس جانے لگا۔ واپس جاتے جاتے قدم رک گئے۔ اس کے قدم آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے۔ دل کہہ رہا تھا اسکول نہ سہی کسی دوسری ضرورت سے تو باہر آ سکتی ہے۔ اس خیال سے وہ پھر پلٹ کر ٹہلنے لگا۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے تقدیر کا دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں تھیلا لیے باہر آئی۔ اعظم نے چند ساعت کے لیے جیسے سانس روک لیا۔ پھر خیال آیا کہ اسے دیکھتے رہنے کے لیے سانس لیتے رہنا چاہیے۔ ورنہ دم باہر ہی رہ جائے گا۔

وہ بہت اچھی تھی۔ وہ بڑا صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ سر اور سینے کو اچھی طرح ڈھانپ رہا تھا اور اس کا آنچل چہرے کے بائیں حصے کو بھی چھپا رہا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اس کے دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کے چہرے کے بائیں حصے پر پڑا ہو گا۔ شا

وہ حصہ سوج گیا ہو گا اس لیے وہ دوپٹے سے سر کو ڈھانپنے کے بہانے چہرے کے اس حصے کو بھی ڈھانپ رہی تھی۔

وہ گھر سے نکل کر گلی کے اُس کنارے چلنے لگی۔ اعظم اس کنارے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ وہ ندی کے دو کنارے بنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان اجنبیت بہہ رہی تھی۔ وہ مونا کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ حسن اسی کو کہتے ہیں کہ ایک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو جی چاہیے۔ مگر چلتے وقت وہ اپنے بائیں پہلو سے نظر آ رہی تھی اور وہ پہلو دوپٹے سے کسی قدر چھپا ہوا تھا۔ اس کی چال میں نزاکت نہیں تھی' اعتماد تھا' جیسے وہ ایک بار گر کر بار بار سنبھلنا جانتی ہو' اور گرانے والے ہاتھوں کو چیلنج کرتی ہو کہ آؤ اب ذرا مجھے ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔

وہ چیلنج قبول کرنے نہیں' تلافی کرنے آیا تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تلافی کیسے کی جا سکتی ہے؟ وہ ساتویں گلی پار کرنے کے بعد دوسری تیسری گلیوں سے گزرتی گئی۔ اعظم اس کے پیچھے پیچھے سبزی مارکیٹ تک پہنچ گیا۔ وہ مختلف دکانوں سے سبزیاں خرید رہی تھی۔ اس کا تھیلا بھرتا جا رہا تھا۔ جام بھر جانے کے بعد چھلکتا ہے۔ تھیلا بھر جانے کے بعد وہ واپس گھر جا کر بند ہو جاتی۔ پھر دروازے سے باہر نہ چھلکتی۔ بس یہی تھوڑا وقت رہ گیا تھا کہ وہ ذرا سی جرأت کرتا۔ اس سے کچھ کہتا' اس کا دل کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس سے باتیں کرنے کے بعد اس کے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

وہ بازار سے واپس جانے لگی۔ جمعے کے روز نماز سے پہلے خریداروں کی بڑی بھیڑ رہتی ہے۔ وہ دونوں آگے پیچھے مرد عورتوں کی بھیڑ سے گزر رہے تھے۔ پھر بازار گزر گیا' وہی گلیاں آ گئیں۔ وہاں اِکا دُکا راہ گیر نظر آ رہے تھے۔ ہمت نہ ہوئی کہ دن دہاڑے ایک اجنبی لڑکی کو مخاطب کرے۔ ہمت نہ ہو تو کچھ نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ ساتویں گلی میں مڑ گئی۔ اچانک ہی اعظم تیزی سے لپکا جیسے فیلڈ سے باہر جانیوالی گیند کو کیچ کرنا ہو۔ وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا جیسے آگے پیچھے کا ہوش نہ ہو۔ وہ مونا کے قریب پہنچا۔ پھر اسے اوور ٹیک کرتے وقت اس کے تھیلے والے ہاتھ پر زور کا ہاتھ مارا۔ مونا کی ایک ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ اس نے اپنی دانست میں ہلکا سا ہاتھ مارا تھا مگر وہ اس طوفان کی زد میں دائیں سے بائیں گھوم کر لڑکھڑائی۔ پھر ایک مکان کی دیوار سے ٹک کر سنبھل گئی۔ تھیلا گر پڑا' سبزیاں بکھر گئی تھیں۔

اعظم نے بیک وقت گھبرانے' پریشان ہونے اور شرمندہ ہونے کی ایکٹنگ کی جلدی سے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مم۔ معاف کیجئے گا' میں جلدی میں تھا۔"

وہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بکھری ہوئی سبزیوں کو اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ میری جلد بازی کسی کو نقصان پہنچائے گی تو میں پہلے ہی ایسی جلد بازی پر لعنت بھیج دیتا۔"

مونا چند لمحوں تک جیسے سکتے کی حالت میں رہی۔ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پرسوں رات ایک حادثہ ہو چکا تھا شاید اسی لیے سہم گئی تھی مگر اب دن وقت تھا' ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ وہ جلدی سے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے اپنے چہرے کے ایک حصے کو چھپاتے ہوئے بولی۔ "جلد بازی کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم دائیں بائیں نہ دیکھ سکو۔ بالکل ہی اندھے بن جاؤ۔"

وہ تھیلے کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اندھا ہی سمجھ کر معاف کر دو یقین کرو میں بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ سمجھ دار تھی اس کی شرمندگی کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے تھیلے کو لیتے ہوئے بولی۔ "کوئی بات نہیں۔"

"یقین کرو ابھی مجھے بالکل ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ آپ سہم گئی ہیں؟"

"میں' نہیں تو.......... میں اتنی بزدل نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

وہ آگے بڑھنے لگی۔ اعظم نے پھر اس کے ہاتھ سے تھیلے کو لیتے ہوئے کہا۔ "میں تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

"نہیں میں خود لے جاؤں گی۔ تم تو جلدی میں ہو۔"

"نہیں۔ اب جلدی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔ کیا محض مجھے دھکا مارنے کی جلدی تھی؟"

"نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ دیکھو نا حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں جب تک ہم زندگی گزارتے ہیں' کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کیا تمہیں پہلے کبھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا؟"

مونا کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ یقیناً اسے پرسوں کی رات یاد آ گئی تھی

اعظم نے زبردستی اس کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا۔ وہ ناراضگی سے بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

"خدا کے لیے ناراض نہ ہونا۔ میں اسی طرح اپنی شرمندگی مٹا سکتا ہوں۔"

"مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔"

"ہاں مگر ہونے کے بعد بھی پشیمانی رہتی ہے۔ یوں سمجھ لو تمہارا بوجھ اٹھانے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے۔"

مونا نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ "میں سچ کہتا ہوں' میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔"

"کیا تم دل سے یہ بات کہہ رہے ہو؟"

اعظم کا دل دھڑکنے لگا۔ "ہاں' ہاں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر سوچنے لگی' پھر بولی۔ "میں ایک چیز نہ خرید سکی کیوں کہ وہ وزنی تھی۔ کیا تم اٹھا کر لا سکو گے؟"

مونا کے چہرے پر سنجیدگی تھی مگر چھپی ہوئی شرارت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ "ایک نہیں ہزار بار۔ تم کہو تو روز تمہارے گھر کا سودا لا دیا کروں۔"

وہ سنجیدگی سے مسکراتی ہوئی واپس بازار کی طرف جانے لگی۔ اعظم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا بات کرنی چاہیے۔ وہ خاموش تھی نہ بول رہی تھی' نہ بولنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اعظم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے کہا۔ "آج کا دن بہت اچھا ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "آدمی اچھی طرح رہنا چاہے تو ہر دن اچھا ہوتا ہے۔"

"بے شک۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا بولے۔ وہ موضوع کی تلاش کرتے کرتے اس کے ساتھ ایک بڑی سی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ دکان کے دروازے پر پہنچ کر بولی۔ "ذرا ٹھہرو میں آتی ہوں۔"

وہ آگے بڑھ کر سیلز مین سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سیلز مین دکان کے اندرونی حصے میں گیا۔ ایک منٹ بعد ہی دو آدمی ایک بڑا سا ڈرم اٹھا کر لائے۔ اس کی اونچائی چار فٹ اور اس کی چوڑائی بھی تقریباً وہی تھی۔ ایسے ڈرم گلیوں میں کچرا پھینکنے

کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ مونا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ "میرا خیال ہے یہ تمہارے لیے زیادہ وزنی نہیں ہو گا۔"

اعظم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں کوئی بات نہیں۔ میں اس سے بھی زیادہ وزن اٹھا سکتا ہوں۔"

اس نے ڈرم کے کنڈے کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر اسے اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ مونا اس کی قیمت ادا کر کے باہر آ گئی۔ اس نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"سنا ہے تکلیف کے بعد راحت ملتی ہے۔"

"اچھا تو تمہیں یقین ہے کہ وہ ملنے والی ہے؟"

"کون؟" اس نے بوجھ کو سنبھالتے ہو پوچھا۔

"وہی راحت جو تمہیں ملنے والی ہے۔ کہاں رہتی ہے وہ؟"

وہ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ڈرم کا کنڈا کلائی میں چبھ رہا تھا۔ وہ کافی وزنی تھا۔ ویسے حقیقتاً وہ زیادہ سے زیادہ وزن اٹھا سکتا تھا مگر اب قلی کی طرح اٹھا کر چلتے ہوئے جھینپ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں زحمت اٹھانا پڑی۔ ویسے تمہارا مقصد پورا ہو گیا ہو گا۔"

"آں .... کیسا مقصد؟ میں تو اپنی غلطی کی تلافی کر رہا ہوں تم کہو گی تو اس سے بھی زیادہ بوجھ اٹھا لوں گا۔"

"تم کتنے اچھے ہو تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ کل مجھے فرنیچر خرید کرلانا ہے۔ تم رہو گے تو گاڑی کا کرایہ بچ جائے گا۔"

"ہائیں........." وہ گھبرا کر بولا۔ "کل......... کل میں بہت مصروف ہوں۔"

"کوئی بات نہیں پرسوں سہی۔"

"آں' ہاں۔ اتفاق سے پرسوں بھی مجھے کام ہے۔ اف یہ کلائی دکھ رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے تمارے پاس دوسری کلائی بھی ہے۔"

"ہاں ہے تو......... مگر........."

"تو بوجھ اِدھر سے اُدھر منتقل کر دو۔"

اس نے بوجھ کو ایک ہاتھ سے دوسرے کی طرف منتقل کر دیا۔ وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"کاش تم سمجھ سکتے کہ تم کتنے احمق لگ رہے ہو۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کاش تم سمجھ سکتیں کہ میں واقعی خود کو احمق سمجھ رہا ہوں۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے خود ہی اٹھانے کے لیے کہا تھا۔"

"ہاں اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ عورت مرد کو بار برداری کا جانور سمجھتی ہے۔"

وہ سات نمبر کے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مونا نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"امی میں ہوں مونا۔"

دروازہ کھل گیا ایک شفیق چہرے والی خاتون نظر آئیں۔ انہوں نے مونا کے پیچھے ایک بوجھ اٹھانے والے قلی کو دیکھا جو بہت عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ پھر حیرانی سے پوچھا۔ "بیٹی۔ یہ کیا؟"

"امی! محلے والوں نے چندہ کیا تھا نا کہ ایک کچرے کا ڈرم خرید کر یہاں گلی میں رکھا جائے۔ اتفاق سے یہ صاحب اٹھا کر لانے کے لیے راضی ہو گئے۔ بس میں لے آئی۔" پھر وہ اعظم کی طرف گھوم کر بولی۔ "تمہارا شکریہ' اسے وہاں دروازے کے باہر رکھ دو۔"

وہ پلٹ کر ڈرم کے بوجھ کو اتار کر دروازے کے باہر ایک طرف رکھنے لگا۔ اسی وقت مونا نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اندر سے خاتون کی آواز سنائی دی۔ "مگر بیٹی! وہ تو کوئی شریف آدمی لگتا ہے۔"

"شریف ہے اسی لیے تو اٹھا کر یہاں تک لے آیا۔"

"تو پھر اسے بلاؤ۔ کم از کم چائے شربت کے لیے پوچھو۔"

"اوہو امی' آپ بھی کمال کرتی ہیں گھر میں چینی ختم ہو چکی ہے اور وہ بھی جا چکا ہے۔ چلئے یہاں سے........."

قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو دور جاتے جاتے گم ہو گئیں۔ خاموشی گہری خاموشی......... وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بند دروازے کو یوں گھور رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار ایسے دروازے کو دیکھ رہا ہو۔

☆======☆======☆

وہ کار کے نیچے ایک چٹائی پر لیٹا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں پلاس لیے کار کے نٹ

بولٹ کو درست کر رہا تھا۔ کام ہو یا آرام ہو' ہر گھڑی ہر لمحہ اسی کی یاد آتی تھی۔ اسی کی باتیں اس کے کان سنتے رہتے تھے جیسے کانوں میں.......... ائیر فون لگا رکھا ہو اور وہ بفرزون کی ساتویں گلی سے گزرتے ہوئے اس سے بولتی جا رہی ہو۔ وہ چائے پیتا تو اس کے لہجے کی مٹھاس لگتی۔ سگریٹ کے کش لگاتا تو دھوئیں کی دُھند میں صاف مسکراتی نظر آتی۔ بھوک لگتی تو اس کے لیے لگتی۔ پیٹ بھر کر کھاتا تو جیسے اس کے لیے توانائی حاصل کرتا۔ ہر جگہ اور ہر احساس میں وہ رچی بسی ہوئی تھی۔

اب محبت کے کچھ اسرار اس پر کھل رہے تھے۔ اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے دیکھنے سے پہلے بہت پہلے اپنے خوابوں کے کسی آئینے میں دیکھ چکا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جاننے سے پہلے کیسے جانتا تھا۔ ایسی پہچان کو کیا کہا جاتا ہے جسے آنکھ نہیں دیکھتی اور دل مدتوں پہلے پہچان لیتا ہے۔ شاید اسی کو شاعری کہتے ہیں۔

وہ دوسرے دن اس سے ملنے نہیں گیا۔ اگرچہ دل بہت چاہتا تھا مگر وہ فرنیچر اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ دن گزر گیا اور وہ رات کو کروٹیں بدلنے لگا۔ تب عشقیہ جذبوں نے ملامت کی۔ عاشق تو لیلیٰ کے کتے سے بھی نہیں ڈرتے۔ سینے پر تیر بھی کھا لیتے ہیں اور وہ فرنیچر اٹھا کر اس کے گھر نہیں پہنچا سکتا۔ لعنت ہے لعنت ہے۔

دوسری صبح وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اس نے کمرے میں رکھے ہوئے ایک بھاری صوفے کو اٹھایا۔ سعید خان نے اپنے بستر سے آنکھ کھول کر پوچھا۔ "یہ ورزش کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کتنا وزنی ہے۔"

"یہ صبح سویرے ایک صوفے کا وزن دیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

وہ لباس بدلنے کے دوران بولا۔ "یار تم تو پیچھے پڑ جاتے ہو' آدمی کو بوجھ اٹھانے کی عادت پڑنی چاہیے۔"

سعید خان بستر پر بیٹھ کر حیرانی سے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا نعیم کی طرح تم بھی دماغی مریض بنتے جا رہے ہو؟"

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بفرزون کی ساتویں گلی میں تھا۔ نئے دن کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ وہ بڑے اچھے موقعے پر پہنچا تھا کیونکہ مونا اسی وقت گھر سے نکل رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مونا نے بو

دیکھا جیسے گھر سے نکلتے وقت یونہی کسی پر نظر پڑ گئی ہو پھر وہ ایک طرف جانے لگی۔ اعظم نے قریب آ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تم.......... تم اچھی تو ہو نا؟"

"ہاں' میں بری کبھی نہیں تھی"

"مم.......... میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو خیریت پوچھ رہا ہوں۔"

"اچھا خیریت پوچھ رہے ہو۔ میں یہاں خیریت سے ہوں اور پولیس والوں سے تمہاری خیریت چاہتی ہوں۔"

"کک۔ کیوں' میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم خواہ مخواہ مجھ سے لفٹ لینے آ جاتے ہو۔"

"خدا کی قسم خواہ مخواہ نہیں میں سچ مچ تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔"

"کیوں دیکھنے آتے ہو؟"

"وہ پتہ نہیں کیوں؟ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے تمہیں نہیں دیکھوں گا تو پھر کچھ نہیں دیکھ سکوں گا۔"

ساتھ ساتھ چلنے کے دوران ہلکی سی ٹکر لگ گئی۔ مونا نے پوچھا "کیا تم واقعی راستہ چلنے کے دوران دائیں بائیں کا خیال نہیں رکھتے ہو۔"

"رکھتا ہوں۔ مگر سچ کہتا ہوں اس وقت مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔"

وہ گھبرا کر بولی۔ "ارے دیکھو یہ سامنے گائے سینگ مارنے آ رہی ہے۔"

وہ ٹھٹھک گیا۔ سامنے کوئی گائے نہیں تھی۔ وہ ہنستے ہوئی بولی "اب مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی تمہیں سجھائی نہیں دیتا ہے۔"

وہ خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ مسکراہٹ اپنی حماقت پر نہیں تھی بلکہ اس یقین پر مسکراہٹ اس کی ہنسی میں دوستانہ لہجے کی کھنک تھی۔ مین روڈ پر آ کر وہ ایک بس اسٹاپ پر ٹھہر گئے "اب میں بس میں جاؤں گی۔"

"پھر کب ملاقات ہو گی؟"

"میں کیوں ملاقات کروں گی؟"

"میں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا زبردستی ہے؟"

"مجھے زبردستی کا حق نہیں ہے۔ مگر تم انکار کرو گی میں روز یہاں آ کر تمہیں دو

ہی دور سے دیکھتا رہوں گا۔"

مونا کے چہرے پر ہلکی سے سرخی آ گئی۔ وہ جلدی سے اس کے پیچھے دیکھتی ہوئی بولی۔ "بس آ رہی ہے۔"

"آنے دو۔ دوسری بس میں چلی جانا۔"

وہ بولی۔ "سمجھ داری یہ ہے کہ پہلا موقع نہیں گنوانا چاہیے۔"

وہ بولا۔ "ہاں میں پہلا موقع گنوانا نہیں چاہتا۔"

وہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ جانے کیا سوچیں تھیں جو اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ بس آئی، ذرا رکی، پھر چلی گئی۔ اعظم نے آہستگی اور بڑے پیار سے کہا۔

"مونا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم نے میری خاطر ایک بس چھوڑ دی۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔"

وہ ذرا گڑبڑا گیا۔ کیوں کہ یہ نام تو اخبار میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ "پرسوں تم نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دینے کے بعد اپنی امی کو اپنا نام بتایا تھا۔"

وہ مطمئن ہو کر بولی۔ "مگر میں نے بے تکلفی سے نام لینے کی اجازت تو نہیں دی ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ناراض ہوتی ہو تو میں تمہیں محترمہ، جنابہ اور بیگم صاحبہ کہہ لیا کروں گا۔ مگر تم اپنے نام کی مٹھاس کو میرے ہونٹوں سے چھین کر ظلم کرو گی۔"

وہ پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی پریشانی تھی جس سے ناراضگی ظاہر نہیں ہوتی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی ہو۔ اتنے میں دوسری بس آ گئی۔ وہ جلدی سے اس پر سوار ہو گئی۔ ایک کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی اعظم اسے بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا اور وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سر جھکانے کے باوجود وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ سوالیہ آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں اور خود اس سے، اسے ہی مانگ رہی ہیں۔

بس آگے بڑھ گئی، وہ پیچھے رہ گیا۔

☆=====☆=====☆

وہ ملاقات بڑی امید افزا تھی، مونا نے زبان سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ آئندہ ملاقات کا وعدہ بھی نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پتہ نہیں زبان سے اور آنکھوں سے کیا کیا باتیں ہو گئی تھیں۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا اور مسکراتا تھا اور اپنی حماقت پر افسوس کرتا تھا کہ باتوں ہی باتوں میں وہ آئندہ ملاقات کی باتیں کرنا بھول گیا تھا۔

دوسری شام وہ اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ صبح ملاقات نہیں ہو سکتی۔ شاید وہ بس میں بیٹھ کر اسکول پڑھانے جاتی ہے۔ شام کو ضرور گھر پر رہے گی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دل دھڑکنے لگا کہ وہ آ رہی ہے۔

دروازہ کھل گیا۔ سامنے اس کی ماں کھڑی تھی۔ وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ محبوبہ کا تصور کرو تو اس تصور میں اس کی ماں کبھی نہیں آتی۔ حقیقی زندگی کا دروازہ کھولو تو سامنے آ جاتی ہے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو بیٹا! بولو کیا بات ہے۔" خاتون کے لہجے میں بڑی شفقت تھی، بڑی ممتا تھی۔ اس ممتا کے سائے میں وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی جوان بیٹی سے ملنے آیا ہے۔

اس نے بہانے بازی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا پھر جلدی سے کہا۔ "جی میں پوچھنے آیا ہوں یہ کچرے کا ڈرم ٹھیک کام کر رہا ہے نا۔ میرا مطلب ہے اس میں کہیں سوراخ ہو تو کچرا باہر گر سکتا ہے۔ اسے بدلا جا سکتا ہے۔"

خاتون نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ، یاد آیا اس روز تم ہی وہ ڈرم اٹھا کر لائے تھے۔ اندر آؤ بیٹا، مجھے افسوس ہے کہ اس روز ہم نے چائے کے لیے تمہیں نہیں پوچھا۔ آؤ، ابھی ہمارے ہاں شام کی چائے تیار ہو رہی ہے۔"

وہ رسمی طور پر بولا۔ "امی! آپ تکلف نہ کریں، میں تو بس یونہی پوچھنے آ گیا تھا۔"

"امی بھی کہتے ہو، تکلف بھی کرتے ہو۔ آ جاؤ بیٹا دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

وہ اندر آ گیا مگر اب اپنے اندر شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ اس ماں کے پاس کھڑا تھا جس کی بیٹی پر رات کی تاریکی میں اس نے حملہ کیا تھا۔ مار کا جواب مار سے ملنا چاہیے تھا۔ اگر وہ خاتون اس کے منہ پر تھپڑ لگا دیتی تو اس کا ضمیر مطمئن ہو جاتا۔ وہ یوں شرمندہ ہو کر نہ

سوچتا۔

خاتون مونا کو آوازیں دیتی جا رہی تھیں۔ ”مونا! ذرا چولہے کے پاس سے یہاں آ جاؤ۔“

”ابھی آئی امی!“ وہی رس بھری آواز دور سے سنائی دی۔ اس آواز کے ساتھ ہی وہ دل لبھانے والی ہستی تصور میں سراپا آ گئی۔ وہ خاتون کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں ضروریات زندگی کا مختصر سا سامان تھا۔ مگر بڑی صفائی اور سلیقے سے اس کمرے کو سجایا گیا تھا۔ خاتون نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کیوں کہ مونا کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی تھی اور حیرانی سے مگر دبی دبی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

خاتون نے مونا سے کہا۔ ”بیٹی یہ پوچھنے آئے ہیں کہ اگر کچرے کے ڈرم میں سوراخ ہو تو اسے بدلا جا سکتا ہے۔“

وہ بیچاری پرانے زمانے کی ایک سیدھی سادی خاتون تھیں۔ آج کل کے چھوکروں کی ہیرا پھیری نہیں جانتی تھیں۔

مونا نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے یہاں آ کر پوچھنے کی زحمت گوارا کی؟“

خاتون نے کہا۔ ”بیٹی اس روز چائے نہیں پلائی تھی چلو جلدی سے اس کی تلافی کرو۔“

اعظم نے کہا۔ ”امی اس روز چینی نہیں تھی‘ میں نے باہر سے سن لیا تھا۔ مجھے راشن شاپ کے دام سے چینی مل جاتی ہے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو کل میں پہنچا دوں گا۔“

مونا کی گھورتی مسکراتی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اچھا تو بار بار آنے کا بہانہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ بدستور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ خاتون نے پوچھا۔ ”کیا تم اسی دکان پر کام کرتے ہو‘ جہاں سے وہ ڈرم آیا ہے‘ تمہارے لباس سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”کبھی ہمارا بہت بڑا گھرانہ تھا۔ اب میں ہوں اور میرا ایک بھائی ہے۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا ہے۔“

ایسا کہتے وقت نعیم کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ بھائی کی محبت میں دوسروں کے لیے نفرت بھری حرکتیں کرتا ہوا‘ عداوتیں مول لیتا ہوا‘ پھر محبت بھرے ایک خاندان میں پہنچ گیا۔ واقعی یہ دنیا گول ہے محبت کی ابتداء سے چلنا شروع کرو تو نفرتوں اور عداوتوں کے کانٹوں سے گزرتے گزرتے آدمی پھر محبت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ شرط اتنی سی ہے کہ آدمی کا دل صاف رہے اور اعظم کا دل ایک آئینہ تھا۔

خاتون نے پوچھا۔ ”تم کہتے کہتے رک گئے‘ کیا سوچنے لگے؟“

”آں‘ کچھ نہیں‘ آپ کی ممتا دیکھ کر امی یاد آ گئیں۔“

وہ مسکرا کر بولیں۔ ”میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم نے بتایا نہیں کیا کرتے ہو؟“

”ہمارا ایک موٹر گیراج ہے۔ ہم سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں فروخت کرتے ہیں اور ان کی مرمت بھی کرتے ہیں۔“

خاتون نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ”مگر یہ کچرے کا ڈرم تم کیوں اٹھا کر لائے تھے؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی معقول سا جواب سوچتا۔ مونا چائے لے کر آ گئی۔ ایک میز پر ٹرے رکھتے ہوئی بولی۔ ”امی آپ کی یادداشت کمزور ہے۔ اس روز میں نے بتایا تھا کہ یہ صاحب دکان پر کچھ خریدنے آئے تھے مجھے کوئی قلی نہیں ملا تو یہ ڈرم اٹھا کر لے آئے۔“

خاتون نے شرمندگی سے کہا۔ ”مونا بڑے افسوس کی بات ہے کبھی کسی کی حیثیت کو سمجھا کرو۔ اسکول ٹیچر بن گئی ہو مگر تمہارا بچپنا نہیں جاتا۔“

وہ چائے کی پیالی اعظم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”چلیے امی! آپ نے وضاحت کر دی کہ یہ میرا بچپنا تھا اور بچوں کو تو بڑے معاف کر ہی دیتے ہیں۔ ان صاحب نے بھی مجھے معاف کر دیا ہو گا۔ کیوں صاحب ٹھیک ہے نا۔“

وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی دل میں اتر رہی تھی۔ اعظم نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر معافی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بھئی آپ کو مددگار کی ضرورت تھی۔ میں نے یہاں تک آپ کی مدد کر دی تھی اس کے بدلے مجھے یہ خلوص اور محبت مل رہی ہے۔“

خاتون ممتا بھرے انداز میں مسکرانے لگیں۔ ”تم بہت اچھے ہو بیٹا! کل چینی لا کر دو

گے نا۔ مونا انہیں پانچ سیر چینی کے پیسے دے دو۔"

اعظم نے کہا۔ "اور ہاں اس میں سے پچاس پیسے کاٹ لینا۔"

خاتون نے حیرانی سے پوچھا۔ "کس بات کے پچاس پیسے؟"

"یہ ایک پیالی چائے جو میں پی رہا ہوں۔ اس کی قیمت پچاس یا ساٹھ پیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھیے برا نہ مانیں آپ کہیں گی کہ گھر میں چائے پلانے کے پیسے نہیں لیے جاتے۔ پھر میں کہوں گا کہ اپنے گھر میں چینی کے پیسے بھی نہیں لیے جاتے۔"

دونوں ماں بیٹی ہنسنے لگیں۔ خاتون نے کہا۔ "بے شک یہ تمہارا گھر ہے مگر تم نے پیسے نہ لیے تو ہماری خود داری یہ گوارا نہ کرے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ ہمارے لیے چینی نہ لاؤ۔"

یہ کیسے ہو سکتا تھا' وہ چینی نہ لاتا تو وہاں دوسری بار آنے کا بہانہ بھی نہ تھا لہٰذا وہ پیسے لینے کے لیے راضی ہو گیا۔ چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ خاتون سلائی کرنے کے لیے مشین کے پاس بیٹھ گئیں۔ مونا اسے رخصت کرنے کے لیے بیرونی دروازے تک آئی۔ اعظم نے آہستگی سے کہا۔ "جمعے کی چھٹی ہوتی ہے اور تم گھر میں رہتی ہو۔"

وہ بولی۔ "کیا جمعے کو چینی لانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ اگر تم انکار نہ کرو تو ہم کہیں آؤٹنگ کے لیے جائیں گے دیکھو انکار نہ کرنا۔"

مونا نے مسکراتے ہوئے گلی کے دروازے کو کھول دیا۔ دروازے پر سات نمبر لکھا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر بولا۔ "تمہاری خاموشی کا مطلب اقرار ہے میں خوش نصیب ہوں نا۔"

مونا نے پیار سے دیکھتے ہوئے' مسکراتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ اعظم نے خوش ہو کر دروازے کے سات نمبر کو دیکھا۔ سات نمبر تو واقعی خوش نصیبی لاتا ہے۔

☆======☆======☆

وہ شام کے چھ بجے گیراج بند کر دیتے تھے۔ اس کے بعد کہیں تفریح کے لیے نکل جاتے تھے یا پھر تاش کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔ نعیم نے کہا۔ "آج تاش کی بازی ہو جائے۔"

سعید خان نے کہا۔ "نہ ابھی مجھے بلیو رنگ کی ٹویاٹا کے ایک دلال سے ملاقات کرنی

ہے۔ یہ گاڑی بڑا منافع دے گی۔ میں جا رہا ہوں' تم دونوں کھیلتے رہو۔"

وہ چلا گیا۔ اعظم بھی کھلی فضا میں گھومنا چاہتا تھا مگر بھائی کی خوشی کے لیے تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ اعظم کے سینے میں بہت اچھا دل تھا۔ نعیم بھی کبھی ایسا ہی تھا۔ ان کی والدہ کہا کرتی تھیں۔ "میرے بچے بڑے ہی محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ ماں کے قدموں تلے جو جنت ہوتی ہے' یہ دونوں واقعی اس کے حقدار ہیں۔"

ماں مرچکی تھی' اگر وہ زندہ ہوتی تو یہ دیکھ کر اس کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا کہ دنیا والوں نے اس کے چھوٹے بیٹے کے دل سے محبت نوچ کر پھینک دی تھی اور محبت نوچنے کے بعد میں جو جگہ خالی رہ گئی' وہاں نفرت' اور انتقام کے انگارے بھر دیئے تھے۔

اعظم اپنے بھائی کو بہلاتے رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے تاش کے پتوں سے بہلا رہا تھا۔ کبھی وہ ہار جاتا تھا کبھی نعیم ہار جاتا تھا۔ ایسے وقت نعیم کو غصہ نہیں آتا تھا کیوں کہ وہ بالکل ہی پاگل نہیں تھا۔ اتنی سُوجھ بُوجھ تھی کہ تاش کے پتے کسی کے نہیں ہوتے۔

اعظم نے کھیلنے کے دوران اسے سمجھایا۔ "نعیم! تم تاش کے پتوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ آدمی کو اپنی زندگی میں کبھی کبھی ہارنا بھی پڑتا ہے مگر تم اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ہارنا نہیں چاہتے یہ بری بات ہے۔"

نعیم نے پوچھا۔ "کوئی میری پسند کی چیز مجھ سے چھننا چاہے تو کیا میں ہار مان کر اسے دے دوں؟ کیوں دے دوں؟ جس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس پر میرا حق ہے' وہ چیز مجھے ملنی چاہیے۔ اگر یہ دنیا میری اتنی سی بات نہیں مانتی تو جاؤ میں دنیا کو نہیں مانتا۔"

اعظم نے بے بسی سے پوچھا۔ "ایسا کب تک ہو گا نعیم؟ اگر تم قانون کی نظروں میں آگئے تو تم کسی مینٹل ہسپتال یا کسی پاگل خانے پہنچا دیئے جاؤ گے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

نعیم نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں کیا کروں۔ میں برداشت کرنا چاہتا ہوں مگر اس وقت برداشت نہیں کر سکتا۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نہیں' میرے اندر کوئی دوسرا ہے۔ اور وہ دوسرا آدمی جب چھینتا جھپٹتا ہے اور کسی راستے میں آنے والے کو کچلتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

وہ کھیلنے کے دوران چھوٹی چھوٹی رقم ہارتے رہے اور جیتتے رہے۔ دونوں بھائیوں

کے پیسے ایک دوسرے کی جیب میں آتے جاتے رہے۔ پھر نعیم نے پتے پھینک کر کہا۔ ”بھوک لگی ہے‘ چلو کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔“

وہ دروازے کو مقفل کر کے باہر آ گئے۔ نعیم سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ بالکل نارمل تھا۔ اعظم کے حساب سے اب ایک دو مہینے کے بعد اس پر دورہ پڑ سکتا تھا۔ یوں بھی وہ چاہتا تھا کہ نعیم کو ایک ہی ماحول میں محدود نہ رکھے۔ اسے گھٹن کا احساس ہو گا تو وہ جھنجلا جائے گا۔ اسی لیے گھومنے پھرنے کے دوران وہ نعیم کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔

وہ لوگ ٹہلتے ہوئے ایک بڑے سے ہوٹل میں آ گئے۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ ساری میزیں بھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اعظم نے کہا۔ ”چلو کسی دوسرے ہوٹل میں چلیں۔“

نعیم نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”مجھے تو یہاں کا کھانا پسند ہے۔ ذرا انتظار کر لیتے ہیں۔ ابھی کوئی نہ کوئی میز خالی ہو ہی جائے گی۔“

وہ دونوں کاؤنٹر کے پاس کھڑے رہے۔ اس ہوٹل کا کھانا پسند کرنے والے اور بھی بھی کچھ لوگ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک میز خالی ہوئی نعیم لپک کر وہاں گیا وہ چھوٹی سے میز تھی‘ وہاں دو ہی آدمیوں کی گنجائش تھی۔ نعیم ایک کرسی پر جا کر بیٹھا۔ مگر دوسری کرسی پر ایک دوسرا نوجوان آ کر بیٹھ گیا۔

اعظم نے اُدھر جاتے ہوئے دیکھا ایک موٹے قد کا مضبوط جسم والا آدمی چمڑے کا جیکٹ پہنے ہوئے نعیم کی پشت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے منہ میں ایک سگار دبا ہوا تھا۔ وہ نعیم کے شانے تھپکتے ہوئے بولا۔ ”اٹھو یہاں سے‘ کوئی دوسری میز دیکھ لو۔“

نعیم نے سر گھما کر اپنے شانے کے پیچھے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم کھڑے ہوئے اچھے لگ رہے ہو۔ اگر یہ تمہارا ساتھی ہے تو اس سے کہو کہ اٹھ جائے میرا بھائی یہاں بیٹھے گا۔“

اعظم نے وہاں پہنچ کہا۔ ”ہمیں بات نہیں بڑھانا چاہیے۔ نعیم اٹھ جاؤ۔“

نعیم نے کہا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے میں اس میز پر آیا ہوں اس لیے پہلے ہم یہاں کھانا کھائیں گے۔“

موٹے سے گینڈے نے دانتوں تلے سگار کو دبا کر بڑی سفاکی سے کہا۔ ”جوان! میں انکار برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ آج کی رات کو اپنے لیے آخری رات نہ بناؤ۔“

اعظم پریشان ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب یہ نعیم کی انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کے اور

نعیم کے درمیان وہ موٹا گینڈا یوں حائل ہو گیا تھا جیسے تار کانٹے کی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو۔ نعیم نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا”ٹھیک ہے‘ اسے میری آخری رات بنا دو۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس میز پر جو کھانا آئے گا‘ اس کھانے تک میرے ہاتھ پہنچیں گے۔“

اعظم کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ طوفانی تصور میں تار کانٹوں کے چاروں طرف دشمن کے مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ باہر کھانا رکھا ہوا تھا۔ نعیم تار کانٹے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر کھانے تک پہنچنا چاہتا تھا اور اس کی ناکامی پر دشمن قہقہے لگا رہے تھے۔

موٹے گینڈے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا”میں نہیں چاہتا کہ اس ہوٹل میں ہنگامہ ہو۔ سنو ہم یہاں سے باہر جائیں گے۔ آگے چلتے رہنے کے بعد بائیں طرف ایک گلی آئے گی۔ اس گلی کے بعد دائیں طرف ایک اور گلی آئے گی۔ اس کے بعد پھر بائیں طرف ایک اندھی گلی ہے۔ وہ ویران رہتی ہے‘ وہاں ہمارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔“

نعیم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا”چلو ہم میں سے جو واپس آنے کے قابل رہے گا وہی اس میز پر کھانا کھائے گا۔“

گینڈے نے ایک ہاتھ اعظم کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا”چھوٹے‘ تم اس آدمی کا خیال رکھنا‘ اسے ہمارے درمیان نہ آنے دینا۔“

چھوٹے نے پوچھا”استاد میں اس سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں؟“

جواب ملا”اگر یہ اپنے ساتھی کی مدد کرنے آئے تو تمہیں میری طرف سے اجازت ہے۔ ورنہ تم دونوں خاموش تماشائی بنے رہو گے اور ہار جیت کا فیصلہ کرو گے۔ میں فری اسٹائل میں بے ایمانی پسند نہیں کرتا۔“

اعظم نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ وہ کمزور یا بزدل نہیں تھا۔ وہ گینڈا خواہ کتنا ہی فری اسٹائل کا چیمپیئن ہوتا۔ وہ تنہا اس سے نمٹ لیتا لیکن بات نعیم کی انا اور ضد کی تھی۔ وہ اپنے کھانے تک خود پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سب خاموشی سے باہر آ گئے۔ گینڈا نعیم کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ان کے پیچھے چھوٹے اعظم کے ساتھ چل رہا تھا تاکہ راستے میں کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کر سکے۔

وہ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس اندھی گلی میں پہنچ گئے۔ وہاں صرف ایک ہی

اسٹریٹ لیمپ کی روشنی تھی۔ گلی کی چوڑائی تقریباً پندرہ فٹ تھی۔ دونوں طرف اینٹوں
دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہ تھا۔ گینڈے نے اپنی چمڑے
جیکٹ اتار کر چھوٹے کی طرف اچھال دی۔ نعیم اپنے ویسٹ کوٹ کے بٹن لگانے لگا۔
کی اس حرکت سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس لڑائی کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا ہے۔
اسے یقین ہو کہ یہ محض ایک دو منٹ کی بات ہے۔ اس میں نہ تو کپڑے پھٹیں گے او
میلے ہوں گے۔

اعظم نے کہا۔ ”نعیم، آؤ سو روپے کی شرط لگالیں مجھے اس سے لڑنے دو‘ اگر میں
جاؤں تو تم مجھ سے سو روپے وصول کرلینا۔“

وہ بولا۔ ”سوری اعظم‘ اس جانور نے مجھے دعوت دی ہے۔ مجھے ہی یہ دعوت ق
کرنی چاہیے۔“

وہ گینڈا اور نعیم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے تھے۔ اعظم اور چھو
اس سے سات سات فٹ کی دوری پر گلی کے دو کناروں پر تھے۔ گینڈے نے نعی
حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تمہیں پتہ چلے گا کہ یہ جانور کس طرح تمہیں چیر
کر چیل کوؤں کی دعوت کرتا ہے۔ چلو ادھر آؤ اور مجھ سے مار کھانے کا پہلا سبق سیکھو

نعیم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے آکر رک گیا۔ ابھی وہ دونوں ا
دوسرے کی پہنچ سے دور تھے اور ایک دوسرے کو تولتی اور پرکھتی ہوئی نظروں سے
رہے تھے۔ گینڈے نے اسے طیش دلانے کے لیے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ”سور
بچے‘ آگے بڑھتے بڑھتے رک کیوں گیا؟ آ اپنے باپ کے پاس آ۔“

نعیم ساکت کھڑا رہا۔ اس نے اپنی مٹھیاں نہیں بھینچی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ا
اسے غصہ نہیں آیا۔ تب اس گینڈے نے کھنکارتے ہوئے اس پر تھوک دیا۔ نعیم نے
کو ذرا سا گھمایا تھا۔ تھوک اس کے منہ پر نہیں شانے پر آیا۔ تب وہ ایک قدم آگے
جیسے تیزی سے دائیں ہاتھ کا مکہ رسید کرنا چاہتا ہو۔ وہ گینڈا فائیٹر یہی چاہتا تھا۔ اس
فوراً ہی گھٹنے زمین پر ٹیک کر نعیم کے دائیں ہاتھ کو تھام لینا چاہا کہ اس کے بازو کو گر
میں لے کر اوپر سے اچھال کر دوسری طرف اسے پھینک سکے۔

اس کم بخت کو کیا معلوم تھا کہ نعیم تربیت یافتہ فوجی ہے‘ اس نے جان بوجھ کر دا
ہاتھ بڑھایا تھا۔ ایک جھکی دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے تیزی سے گھوم کر بائیں

ں الٹی ہتھیلی اس کی کنپٹی پر رسید کی تھی۔ پھر اتنی ہی پھرتی سے واپس گھوم کر وہی دایاں
تھ اس کی ناک پر رسید کیا۔ آخر میں اچھل کر اس سے ایک قدم دور چلا گیا۔

وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ پیچھے کی جانب الٹ کر گر پڑا تھا۔ نعیم ہونٹوں پر زبان
یرتے ہوئے اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا اور نعیم کو سمجھتی
ئی نظروں سے سمجھ رہا تھا کہ اس کے مقابل کوئی اناڑی نہیں ہے۔ بہر حال وہ گھٹنے
ے بل اٹھا۔ سامنے زمین پر دونوں ہاتھ ٹیکے جیسے ہاتھوں کے سہارے اٹھنا چاہتا ہو لیکن یہ
ہوکا تھا۔ وہ ہاتھوں کے بل لیٹے ہی لیٹے گھوم گیا۔ گھومتے ہوئے اس نے نعیم کی ٹانگ پر
ت ماری۔ نعیم اس داؤ کو سمجھ نہ سکا تھا۔ دھوکے میں مار کھا کر گر پڑا۔ مگر تیزی سے
ا۔ گینڈے نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی‘ وہ اس سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے نعیم
ے پیٹ میں ایک ٹھوکر ماری۔ نعیم کے منہ سے ”اونک“ کی آواز نکلی۔ وہ پیٹ پکڑ کر
سری طرف گھوم گیا۔ اس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ شدید تکلیف کا سامنا ہے۔

بھائی کو تکلیف میں دیکھ کر اعظم کا دل ڈوبنے لگا۔ وہی نعیم کا بھائی تھا‘ باپ بھی تھا
ر ماں کی طرح پیار کرتا تھا۔ افسوس کہ لڑائی کے اصول کے مطابق وہ مداخلت نہیں کر
کتا تھا۔

نعیم جلد ہی سنبھل گیا۔ اب وہ پھر آگے بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بائیں
تھ سے باکسنگ کا ایک پنچ دیا جیسے گھونسہ مارنا چاہتا ہو مگر وہ ایک جھکی تھی۔ گینڈے نے
کے لیے سر کو پیچھے کی طرف جھکایا۔ یعنی آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ پھر دوسرا پنچ‘ پھر
را‘ وہ گینڈا بچاؤ کے لیے ایک ایک انچ پیچھے جا رہا تھا۔ نعیم باقاعدہ ایک باکسر کی طرح
ں پاؤں کے پنجوں پر اٹھتا جا رہا تھا۔ ایک ایک انچ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تب اچانک ہی
نے دائیں ہاتھ کا ایک زبردست گھونسہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ گینڈا لڑکھڑاتا ہوا
گیا پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔

اس بار نعیم نے اسے فوراً ہی اٹھنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے جھک کر اس کی ایک
کو ٹخنے کے پاس سے گرفت میں لیا۔ پھر اسے کھینچ کر بائیں سے دائیں گھمایا۔ پہلے
دائرے میں پھر مکمل دائرے میں گھماتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ وہ جیسے فضا میں بہتا
گیا۔ پھر اس کا سر گلی کی اس دیوار سے ٹکرایا جہاں چھوٹے کھڑا ہوا تھا۔

استاد کی پٹائی سے عبرت حاصل ہو گئی تھی۔ چھوٹے اچانک ہی بھاگتا چلا گیا۔ اتنی

سی دیر میں استاد کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ پختہ دیوار سے ٹکرانے کے بعد سر کہیں سے جیسے گیا تھا۔ بہتے ہوئے لہو سے چہرہ بھیگ رہا تھا۔ وہ سہارے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کو ٹٹول رہا تھا۔ بار بار آنکھیں میچ کر یوں دیکھ رہا تھا جیسے دکھائی نہ دے رہا ہو۔ نعیم ایک قدم بڑھاتا ہوا اس کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ہانپتے ہوئے اور تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا۔ "بب' بس کرو ہار مانتا ہوں۔"

اعظم نے نعیم کے پیچھے آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اسے سز چکا ہے نعیم! تم اس میز کو جیت چکے ہو۔ اسے جانے دو۔"

نعیم نے اپنے شانے پر سے اعظم کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ذرا ایک منٹ تم ہو کہ میں کسی کو جیتنے کے بعد اسے مزید جیتنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک چھوٹا سا کام رہ گیا اے اٹھو۔"

اس نے اٹھنے کا حکم دیا۔ استاد ڈولتا ڈگمگاتا ہوا اٹھا۔ اس کا لہو میں ڈوبا ہوا سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ شاید اسے اچھی طرح دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا نے اس کی ایک انگلی سے اپنے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں گینڈے کا تھوک رہا تھا۔ اسے نے سرد لہجے میں کہا۔ "چلو اس واپس چاٹ لو۔"

استاد نے ہچکچاتے ہوئے اسے دیکھا۔ نعیم کی دونوں آنکھیں دو دھاری ت طرح چمک رہی تھیں۔ وہ قتل کر سکتا تھا' معاف نہیں کر سکتا تھا۔ استاد نے آگے اپنا تھوکا ہوا چاٹ لیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد نعیم اس میز کے کھانے کو جیت کر اپنے بھائی کے ساتھ د کھا رہا تھا۔

☆======☆======☆

اعظم نے اپنے گیراج سے گاڑی نکالی۔ وہ گاڑی فروخت کے لیے رکھی گئ لیکن جمعہ کے دن وہ مونا کو اس میں بٹھا کر سیر کرا سکتا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر ب اسٹاپ کے پاس پہنچ گیا جہاں سے مونا روانہ ہوا کرتی تھی۔ ملاقات کے لیے وہ لیے مقرر کی گئی تھی کہ محلے والے کسی کار والے کو اس کے دروازے پر دیکھ بنانے لگتے۔

جب وہ وہاں پہنچا تو مونا ایک منٹ کے بعد وہاں آئی۔ اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ مونا نے بیٹھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ اعظم کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "میں وقت سے پندرہ منٹ پہلے آ گیا ہوں۔"

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں آدھ گھنٹہ پہلے آ گئی تھی۔"

اعظم کا دل باغ باغ ہو گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ صرف وہی دیدار کے لیے بے چین ہے۔ پندرہ منٹ پہلے آ گیا تھا۔ مگر دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اُدھر کچھ زیادہ تھی۔ لڑکیاں زبان سے نہیں بولتیں مگر ان کی ادائیں چغلی کھاتی ہیں۔ وہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر آ کر پھر وہاں سے دور ٹہلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ تاکہ دوسرے یہ نہ سمجھیں کہ وہ کسی کا انتظار کر رہی ہے۔

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"کہیں بھی جائیں گے' ہر جگہ جائیں گے' آج کا دن ہمارا ہے۔"

وہ اپنی باسکٹ کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ "میں کچھ کھانے کے لیے لائی ہوں۔"

"اچھا' میں بھی کچھ پھل وغیرہ لے آیا ہوں۔ پچھلی سیٹ پر ہیں۔ اچھی خاصی پکنک رہے گی۔"

"کیوں نہ ہم پہلے دریا کی سیر کریں۔ تقریباً پانچ چھ سال پہلے میں نے کشتی کی سیر کی تھی۔ آج پھر دل چاہ رہا ہے۔"

اعظم نے گاڑی کو دوسرے راستے پر موڑ دیا۔ دونوں کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ سوچ میں گم تھی۔ اعظم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ دائیں زاویے سے اس کا چہرہ اور زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ غزالی آنکھوں پر گھنی پلکوں کی چھاؤں تھی۔ ستواں ناک اور خوبصورتی سے تراشے ہوئے لب گلابی گلابی تھے۔ اس کے حسن کی یہ خوبی تھی کہ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی اور اس کے دل پر قدرتی حسن کی دھاک بٹھا دی تھی۔

اعظم کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح اس کے حسن کی تعریف کرے۔ اس نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے تمہیں دیکھ کر خوبصورت اشعار گنگناؤں مگر میں موٹر مکینک ہوں' مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "شعر یاد نہ ہوں اور کسی کے لیے شعر ڈھونڈے جائیں۔"

میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑھ کر کسی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”تم بہت سمجھ دار ہو۔ موسم کے لحاظ سے بہت ہی خوبصورت اور خوش رنگ لباس پہنا ہے اور میں بہت ہلکی ہلکی سی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔“

”میں خوشبو نہیں لگاتی۔“

”شاید یہ تمہاری قربت کا احساس ہے جو معطر معطر ہے۔“

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”مجھے تو تمہاری قربت سے گریس اور موبل آئیل کی بُو آ رہی ہے۔“

”تعجب ہے‘ آج میں نے اچھی طرح غسل کیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بُو کار کے کسی حصے سے آ رہی ہے۔ تم اپنے اطمینان کے لیے ذرا مجھے سونگھ کر دیکھ لو۔“

سونگھنے کے لیے قریب آنا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے ہی کار نے ایک موڑ کاٹا۔ وہ ہوا کے سبک جھونکے کی طرح اس پر آ گری۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس طرح سونگھتی ہو۔“

وہ جھینپ کر جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنا دوپٹہ درست کرتی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ ایک ننھا سا حسین لمحہ اعظم کو چھُو کر چلا گیا تھا۔ اس کے خیالوں میں قربتیں گنگنانے لگیں۔ لہراتا ہو آنچل اس کی سوچ میں خوشبو لٹا رہا تھا۔ ہائے کوئی چاہنے والا ہو‘ کوئی پاس آ کر دل میں دھڑکنے والا ہو‘ کوئی اچھی زندگی کا سپنا دکھانے والا ہو تو یہ زندگی کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اے میری زندگی کے پیارے لمحے تُو یوں مجھے چھو کر گیا ہے تو ایسے ہی مونا کی طرح پاس پاس رہتا۔ محبت کے حادثاتی موڑ پر بار بار چھُونے کے لیے..........

ایسے وقت اس نے اپنی پچھلی زندگی کا حساب کیا۔ وہ کنوارا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کی زندگی میں آئے۔ لڑکیاں آئی تھیں چند لمحوں کی خوشیاں اسے بھیک دے کر چلی گئی تھیں۔ جہاں جذبوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے‘ وہاں پیار کی سچائی نہیں ہوتی۔ کیا مونا کے لیے اس کے دل میں پیار کی سچائی ہے؟

یہ سوال کانٹا بن کر چبھ گیا۔ کیوں کہ سچائی کے پیچھے کوئی جھوٹ اور فریب نہیں ہوتا اور وہ مونا کو فریب دے رہا تھا۔ اپنے ضمیر کے کانٹے کو اس محبت کرنے والی لڑکی سے چھپا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک اہم سوال سر اٹھا رہا تھا کہ وہ مونا سے محبت کر رہا ہے

یا اپنی پچھلی زیادتی کی تلافی کر رہا ہے؟

وہ پریشان ہو کر مونا کے دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھی کے اندر ہونے والی جنگ سے بے خبر تھی۔ عورت چاہتی ہے کہ کوئی اسے پھول کی نزاکت سے اٹھائے۔ پھر کبھی کبھی کانٹے کی طرح چبھتا رہے تو وہ اسے برداشت کر لیتی ہے مگر جو پہلے ہی کانٹا بن کر پاؤں میں چبھ جائے اسے فٹ پاتھ پر گرا دے اور اسے بے سہارا چھوڑ کر بھاگ جائے تو وہ ایسے کانٹے کو ہرگز برداشت نہیں کرتی۔ پتہ نہیں مونا کا مزاج کیا تھا؟

وہ دریا کے ساحل پر پہنچ گئے۔ ساحل گارڈن کے پارکنگ ایریئے میں اس نے کار کھڑی کر دی۔ شام تک کے لیے کار ٹوکن حاصل کیا۔ پھر مونا کے ساتھ بوٹ ہاؤس کے ایک دفتر میں آیا۔ وہاں اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھا کر پیشگی رقم ادا کرنے کے بعد ایک کشتی حاصل کی۔ وہاں کا ملازم ان کے ساتھ ساحل تک آیا۔ پھر ایک کشتی کی رسی ان کے لیے کھول دی۔ پہلے وہ کشتی پر سوار ہوا‘ پھر اس نے مونا کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بلا لیا۔ ملازم نے کھانے پینے کا سامان وہاں رکھ دیا۔ اس کے بعد کشتی کا سفر شروع ہو گیا۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی کے دونوں کناروں پر لگے ہوئے چپوؤں کے ہینڈل اعظم کے ہاتھوں میں تھے اور وہ دریا کے مخالف بہاؤ کی سمت کشتی کھے رہا تھا۔ مونا نے کہا۔ ”اس طرح تم تھک جاؤ گے۔ تمہیں دریا کے بہاؤ پر چلنا چاہیے۔“

”ادھر دوسرے جوڑے جا رہے ہیں۔ سب تنہائی چاہتے ہیں۔ میں اتنی محنت سے جدھر جا رہا ہوں‘ ادھر ہمیں تنہائی میسر ہو گی۔“

مونا نے سر جھکا لیا۔ سب ہی پیار کرنے والے تنہائی چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کی باتیں نہ سنے‘ کوئی انہیں نہ دیکھے۔ بس وہ ایک دوسرے کو دیکھتے اور سنتے رہیں۔ محبت میں یہ پردہ داری محبت کو اور بڑھاتی ہے۔

ہلکی ہلکی سردی تھی‘ ہلکی ہلکی دھوپ تھی۔ آگ بھی تھی اور ٹھنڈک بھی تھی اور وہ سامنے تصویر کی طرح بیٹھی تھی۔ وہ چپ تھی اور اس کا حسن و شباب چپ کی ہزاروں زبانوں سے بول رہا تھا۔ اعظم نے کہا۔ ”چپ کیوں ہو کچھ سوچ رہی ہو؟“

”تم بھی چپ ہو کچھ سوچ رہے ہو؟“

”میں سنا کرتا تھا کہ دریا کی لہریں گنگناتی ہیں۔ میں نے کئی بار کان لگا کر سنا مگر مجھے سنائی نہیں دیا۔ آج تم میرے ساتھ ہو تو یہ لہریں اپنا ترنم سنا رہی ہیں۔ مونا تم نے مجھے

گیتوں اور لہروں کا ایک ایک لہجہ سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی لہروں سے کھیلتی ہوئی بولی۔ "تم تو شاعری کر رہے ہو۔ کسی پہلو سے موٹر مکینک نہیں لگ رہے ہو۔"

"واقعی مونا دل کی زبان سے بولو تو ہر بولی شاعری بن جاتی ہے آج زندگی کے بہت سے راز کھل رہے ہیں۔"

وہ کھلکھلانے لگی۔ لہریں بھی کھلکھلا رہی تھیں۔ آبی پرندے سروں پر سے گزرتے ہوئے سرگم سنا رہے تھے۔ دو طرفہ چپو پانی میں ڈوب رہے تھے اور گنگناتے ہوئے ابھر رہے تھے۔ انہیں لچکتی ہوئی لہروں کے بدن پر سے گزار رہے تھے۔ وہ ہنستے بولتے ہوئے بہت دور نکل آئے۔ دریا کے ایک موڑ پر وہ ساحلی گارڈن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب دور دور تک سناٹا تھا۔ دونوں ساحل خاموش اور ویران تھے۔ مونا نے کہا۔ "ہم بہت دور نکل آئے ہیں تم تھک گئے ہو گے۔"

"پیار کے سفر میں تھکنا کیسا؟"

"اچھا تو یہ پیار کا سفر ہے۔ میں نے تو کبھی پیار کا اقرار نہیں کیا۔"

"میں نے سنا ہے لڑکیاں اقرار نہیں کرتیں۔"

"پھر کیا کرتی ہیں؟"

"یا تو سینڈل اتار لیتی ہیں یا پھر اپنی باتوں اور اداؤں سے چپ چاپ اپنی پسند کا اظہار کر دیتی ہیں۔ دیکھو تم مخالفت میں کچھ نہ کہنا۔ میری خوش فہمی کو ٹھیس پہنچے گی۔"

باتوں باتوں میں ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں بہے جا رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں دنیا بھلا دی تھی۔ بہت دور نکل آنے کے بعد آگے دریا کا ایک حصہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا تھا۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سے کاٹج نظر آ رہا تھا۔ اعظم نے کہا۔ "ہم وہاں چلیں گے۔"

مونا نے پوچھا۔ "وہاں کون رہتا ہے؟ وہ جزیرہ یقیناً کسی کی ملکیت ہو گا۔"

"وہ کسی کا بھی ہو۔ آج تو ساری دنیا ہماری ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "جب وہاں کا مالک بھگائے گا تو سارے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔"

"اللہ مالک ہے۔ ہم اس جزیرے کے مالک سے کہیں گے کہ ہم دو محبت کرنے والے دنیا اس نکڑے چلے آئے ہیں صرف آج کے دن ہمیں اس جزیرے کا مالک بنا دو۔ جیسے ہمایوں نے نظام سقہ کو ایک دن کا بادشاہ بنایا تھا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اس کنارے پر پہنچ گئے جہاں پتھروں کو جما کر ایک گھاٹ بنا دیا گیا تھا۔ اعظم نے کشتی سے اتر کر اس کی رسی کو ایک ساحلی درخت سے باندھ دیا۔ پھر مونا کو کشتی سے اترنے کے لیے سہارا دیتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی مملکت میں ملکہ عالیہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

وہ ساحل پر پہنچ کر بولی۔ "اس مملکت سے دم دبا کر بھاگنے سے پہلے یہاں کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لو۔"

وہ کشتی پر سے کھانے کا باسکٹ اور پھلوں کی ٹوکری اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہاں تو بڑا سناٹا ہے۔ کوئی نظر نہیں آ رہا۔ آؤ آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ اعظم نے منہ اٹھا کر پکارا "کوئی ہے؟"

"ہے' ہے' ہے.........." بازگشت کا جواب سنائی دینے لگا۔ کبھی کبھی آواز جیسے پتھر کی طرح لگتی ہے۔ پرندے اِدھر سے اُدھر چہچہاتے ہوئے اڑنے لگے۔ شاید پہلی بار اس دنیا کی ویرانی میں ایسا ہی ہوا ہو گا۔ پرندوں نے آدم و حوا کو زمین پر قدم رکھتے دیکھ کر اسی طرح اِدھر سے اُدھر پرواز کی ہو گی۔ وہ جزیرہ چھوٹا سا تھا۔ دور تک چاروں طرف ساحل نظر آتا تھا۔ شاید کسی عیاش دولتمند نے کبھی کبھی رنگین لمحات گزارنے کے لیے وہ کاٹج بنوایا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی چھٹی منانے اپنی بیوی بچوں کے پاس چلا گیا ہو۔

کاٹج کا دروازہ شاید بہت دنوں سے مرمت طلب تھا جہاں تالا لگایا گیا تھا۔ اس حصے کی لکڑی بارش میں بھیگ کر کمزور پڑ گئی تھی۔ کنڈی کا وہ حصہ اکھڑا ہوا لگتا تھا۔ اعظم نے کہا۔ "دروازہ کھل سکتا ہے۔"

"کیا تم بغیر اجازت اندر جانا چاہتے ہو؟"

"کوئی ہو تو اجازت لی جائے۔" وہ اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر ایک درخت کی ٹوٹی ہوئی پتلی سی ٹہنی لے کر آیا۔ پھر اسے کنڈی میں پھنسا کر جھٹکے دیئے۔

"یہ جرم ہے ہمیں کسی کے مکان میں اس طرح داخل نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بولا۔ "ہم چوری کی نیت سے نہیں جا رہے ہیں۔" اتنا کہتے ہی کنڈی ایک جھٹکے سے اکھڑ گئی۔ دروازے کے دونوں پٹ کراہتے ہوئے آپ ہی آپ کھلتے چلے گئے۔ اند سیلن تھی، عجیب سی بو کا بھبھکا باہر آیا۔ یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ کاٹج بہت عرصے سے بند ہے۔ شاید وہاں گرمیوں کے موسم میں کوئی آتا ہو گا۔

"میں اندر نہیں جاؤں گی۔ یہ سراسر جرم ہے۔"

"مونا! ہم اپنی صفائی میں کہہ سکتے ہیں کہ دریا کے سفر میں ہم یہاں پہنچ کر تھک گئے تھے۔ دروازے کی کنڈی پہلے سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہمیں کوئی نظر نہ آیا ورنہ ہم یہاں تھکن اتارنے سے پہلے اجازت ضرور لیتے۔"

"کچھ بھی ہو، میں کسی کے مکان میں نہیں جاؤں گی۔"

"میں تم سے درخواست کروں گا۔"

"واپس چلو۔" وہ واپس جانے کے لیے باسکٹ اٹھانے جھک رہی تھی۔ اعظم نے جھک کر اچانک ہی اسے دونوں بازوؤں سے اٹھالیا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "چھوڑو مجھے۔"

"اندر پہنچا کر چھوڑ دوں گا۔"

وہ بازوؤں کی بلندی سے اترنے کے لیے دونوں پاؤں چلانے لگی۔ ایسی جدوجہد کے وقت وہ اسے لے کر دروازے سے نہیں گزر سکتا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی ساکت ہو کر ہانپنے لگی۔ اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ تڑپنے کے دوران سینہ بہ سینہ ہو رہی ہے۔ جہاں جہاں سے کورے بدن کو کترانا تھا، وہاں وہاں سے ٹکرا رہی ہے۔ اسی لیے وہ ایک دم سے چپ ہو گئی تھی۔

وہ اسے اٹھائے ہوئے کاٹج کے اندر آ گیا۔ وہ کاٹج دو کمروں، ایک کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ جس کمرے میں وہ داخل ہوئے اس کمرے کا فرنیچر بتا رہا تھا کہ ڈرائنگ روم ہے۔ اس نے مونا کو ایک صوفے پر ڈال کر کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم باہر نہیں بھاگو گی۔"

"میں بھاگ جاؤں گی۔ تم نے مجھے اس طرح کیوں اٹھایا؟"

"اگر بھاگو گی تو پھر اٹھاؤں گا۔ یہ تمہارا تڑپنے والا حادثہ بہت اچھا لگا۔"

مونا نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر حیا کا رنگ آ رہا تھا۔ حیا کے ان

لمحات سے گزرنا بڑا کٹھن نظر آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح گزرے؟ آخر وہ اعظم کا دھیان بٹانے کے لیے بولی۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"کھانے کا سامان تو دروازے پر رہ گیا۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں کے تمام سامان پر مہینوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اس نے ایک میز پر سے میز پوش کو اٹھایا۔ پھر اس کپڑے کی گرد جھاڑ کر فرنیچر وغیرہ پر جمی ہوئی گرد جھاڑنے لگی۔ تعلیمافتہ لڑکیاں صفائی اور سلیقے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اعظم کھانے کا سامان اٹھا کر لے آیا۔ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہتے ہیں عورت ایک گھر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور کوئی سا بھی گھر عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔"

مونا نے پوچھا۔ "تمہارے گھر کی صفائی کون کرتا ہے؟"

"کوئی کرنے والی ابھی تک زندگی میں نہیں آئی تھی۔ ابھی عورت اور گھر کو ایک ساتھ دیکھ کر یہ خیال آ رہا ہے کہ میں نہ گھر کا ہوں اور نہ گھاٹ کا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی صفائی ہو گئی۔ پھر وہ کچن سے ایک جگ اور گلاس دھو کر پانی لے آئی۔ اس کے بعد وہ کھانے کے لیے میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اعظم نے کہا۔ "جب شناسائی کی ابتدا ہوتی ہے تو لڑکا اور لڑکی روبرو بیٹھتے ہیں۔ بیچ میں میز کی خلیج حائل ہوتی ہے۔ ہماری تو دوستی ہو چکی ہے۔ ہمیں شانہ بشانہ ساتھ ساتھ بیٹھنا چاہیے۔"

وہ ایک لقمہ چباتی ہوئی بولی۔ "تم وہیں اچھے لگ رہے ہو۔ میرے پاس نہ آنا۔"

"تمہارے جیسی حسین لڑکی کو لقمہ چباتے ہوئے بولنا نہیں چاہیے۔ کارٹون لگتی ہے۔"

"بھوک کے وقت صرف بھوک اہم ہوتی ہے۔ آدمیت کا سارا حسن مر جاتا ہے۔ اسی لیے مفلوک الحال شاعر روٹی اور انقلاب پر شاعری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نامور شاعروں کے لیے زیادہ سے زیادہ آمدنی کے ذرائع مہیا کیے جاتے ہیں تاکہ وہ گل و بلبل کی شاعری کو جدید انداز میں پیش کرتے رہیں۔"

اعظم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کرو یوں لگتا ہے جیسے تم اپنی کلاس میں بچوں کو سبق پڑھا رہی ہوں۔ بھئی میں بچہ نہیں ہوں۔ زندگی کا چہرہ جہاں جہاں سے بگڑتا ہے اس بگاڑ کو

میں خوب سمجھتا ہوں۔ ہماری اجتماعی جدوجہد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے ہم فرداً فرداً اپنے حالات سے لڑتے ہیں۔ اس لڑائی کے دوران زندگی کی کچھ مسرتیں نصیب ہوتی ہیں تو ان مسرتوں کو ہم عید کی طرح گزار لیتے ہیں۔ بس مونا ہمیں صرف زندگی کے حسن کی باتیں کرنی چاہئیں۔"

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچن میں آئے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ خیال تھا کہ اس کاٹیج والے نے کھانے پینے کا سامان چھوڑا ہو گا۔ مگر گیس کا سلنڈر خالی تھا اور چائے کا سامان بھی نہیں تھا۔ اعظم نے کہا۔ "کاش اس وقت الہ دین کا طلسمی چراغ ہوتا۔ میں جن کو بلا کر فوراً ہی چائے کی دو پیالیاں طلب کرتا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر ایک کوئل کوکنے لگی۔ مونا نے کہا۔ "بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں جب کسی خواہش کا اظہار ہوتا ہے تو ٹھیک اسی وقت کوئی پرندہ بولے تو وہ خواہش ضرور پوری ہوتی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "چولہے میں تیل نہ ہو' چینی اور چائے کی پتی نہ ہو تو غیب سے چائے آجائے گی۔"

وہ بولی۔ "میرا مطلب ہے ایسے وقت ایسی خواہش کرنی چاہیے جو پوری ہو سکے۔"

اسی وقت کوئل پھر کوکنے لگی۔ اعظم نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئل کی کوک میں ایک خواہش کی ہُوک اٹھتی ہے۔ پی کہاں؟ پی کہاں؟ اور مونا پی یہاں ہے۔ اس کی خواہشات کی دنیا میں تم ہی تم ہو۔"

وہ ہولے ہولے لرزنے لگی۔ جیسے کورے بدن کی کوئل ہولے ہولے خاموشی سے کوک رہی تھی۔ اس کی چھپی چھپی ہوئی کوک کو وہی چھونے والا سمجھ رہا تھا۔ اس نے چہرہ جھکا کر مونا کے چہرے پر رکھ دیا۔ بڑے پیار سے بڑے جذبوں سے اس کے چہرے کی نرمی اور گرمی کو اور ملائمت کو محسوس کرتا رہا۔ ایسے وقت اسے سب کچھ بھول جانا چاہیے تھا اور وہ سب کچھ بھول رہا تھا۔ مگر تقدیر عجب تماشا دکھاتی ہے۔

اس نے اپنے ہی ہاتھوں وہ تماشا دیکھا۔ کیونکہ چہرہ بالکل چہرے کے قریب تھا اس لیے مونا کے رخسار کا وہ بایاں حصہ نظر آگیا۔ جہاں ایک رات اس کا گھونسہ پڑا تھا۔ بیک وقت اس کے ضمیر نے تڑپ کر کہا۔ "جہاں ظلم کرتے ہو وہاں معافی طلب کرنے سے پہلے پیار کرنا چاہتے ہو' یہ تمہاری محبت نہیں بے ایمانی ہے۔"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مونا' مونا............"

وہ چپ رہی تھی شاید سمجھ رہی تھی کہ وہ جذبوں کی ہلچل میں اسے آوازیں دے رہا ہے۔ وہ شرمیلی تھی اس لیے چپ تھی۔ مگر دل کی پاگل دھڑکنیں اسے پکار رہی تھیں۔ اعظم نے پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مونا اس رات تمہارے اس رخسار پر ایک زخم لگا تھا۔"

وہ چونک کر ذرا پیچھے ہو گئی۔ "تم.......... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

اعظم نے سر جھکا لیا۔ اس میں نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آہستگی سے بولا۔ "وہ زخم میں نے پہنچایا تھا میں۔ میں اتنا شرمندہ ہوں کہ.........."

"کیوں مذاق کر رہے ہو۔ جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو غصہ سے خون کھولنے لگتا ہے۔ بزدل کمینہ' بھاگ گیا تھا.........."

وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ ہولے سے سر کو جھٹک کر بولی۔ "میں سمجھ گئی۔ اس روز کچرے کا ڈرم اٹھا تم ساتھ چل رہے تھے تو میرے چہرے کی سوجن دیکھ لی تھی۔ یا پھر امی نے تمہیں بتایا ہو گیا۔"

"مجھے کون بتائے گا؟ جب کہ میں خود ہی تھا۔"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بے یقینی تھی۔ پھر وہ ٹوٹے ہوئے اعتماد کے سخت لہجے میں بولی۔ "مجھے یاد آیا کہ اخبار میں اس واقعہ کے ساتھ میرا نام بھی شائع ہوا تھا۔ تم نے اخبار میں پڑھا ہے۔"

اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی جیسے وہ اس ناگوار واقعہ کی یاد کو جبراً برداشت کر رہی ہو۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ایسے خوش گوار لمحات میں' میں کبھی یہ بات نہ چھیڑتا۔ لیکن کیا کروں میرا دل محبت میں بے ایمانی پسند نہیں کرتا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں جس کے لیے تمہارے دل سے گالیاں نکلتی ہیں' وہ میں ہوں.........."

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر سختی آ گئی تھی۔ وہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں جو پیار سے دیکھتی تھیں' اب دہشت زدہ ہو کر دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی ظالم سامنے کھڑا ہو۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے رس بھرے ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی' جیسے نفرت کا لاوا اُبلنے والا ہو۔

اعظم نے جلدی سے کہا۔ "پہلے میری بات سن لو کہ ایسا کیوں ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ بس اتفاقاً ایسا ہوا کہ........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ تیزی سے پلٹ کر کچن سے باہر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ چند لمحوں تک اعظم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے ڈرائنگ روم میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگتی جا رہی تھی' پھر خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ کاٹج سے باہر چلی گئی تھی۔ تب اس نے چونک کر آواز دی۔ "مونا۔ مونا........."

وہ کچن سے باہر آیا۔ وہ ڈرائنگ روم جسے ایک عورت نے گھر کی طرح مکمل کیا تھا' وہ اس عورت کے بغیر خالی تھا۔ جیسے گلدان سے پھول اور سینے سے دل نوچ لیا گیا ہو۔ ایسا ہی خالی تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا۔ تیزی سے چلتا ہوا کاٹج سے باہر آیا۔ وہ دور ساحل پر نظر آ رہی تھی۔ درخت کے پاس جھکی ہوئی کشتی کی رسی کی گرہ کھول رہی تھی۔

وہ آوازیں دیتا ہوا اُدھر لپکا۔ اس کی آواز سن کر وہ گھبرا گئی۔ رسی کی گرہ نہیں کھل رہی تھی۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر چیختی ہوئی بولی۔ "خبردار' میرے قریب نہ آنا۔"

مگر وہ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی کشتی کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں سے ایک چپو کو اٹھا کر ہتھیار بناتے ہوئے بولی۔ "میرے قریب آؤ گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔"

وہ اس کے سامنے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "میرا سر توڑ دو۔ تم حملہ کرو میں اُف نہیں کروں گا۔ میں اپنی سزا پانا چاہتا ہوں۔"

"اب میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گی۔ مجھے چپ چاپ یہاں سے جانے دو ورنہ ہم دونوں میں سے کسی کی جان جائے گی۔"

"میری جان جائے گی۔ لو مجھے مار ڈالو۔"

وہ آگے بڑھا۔ مونا کے ہاتھ میں چپو گھوم گیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے حملہ کیا تھا۔ مگر نازک ہاتھوں کے حملے کو اس نے روک لیا۔ اب دونوں نے چپو کے دونوں سروں کو اپنی اپنی طرف سے تھام رکھا تھا۔ مونا نے ناکام ہو کر ہتھیار کو چھوڑ دیا۔ بدحواسی میں اسے خیال نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ فوراً ہی پلٹ کر بھاگنا چاہا تو دریا میں گر پڑی۔ پانی کے چھینٹے دور تک اچھلتے چلے گئے۔

"رک جاؤ مونا۔ آگے گہرائی ہے۔"

مگر وہ جیسے ڈوبنا ہی چاہتی تھی۔ کچھ دہشت نے اور کچھ غصے نے اسے محبت کے

بازوؤں میں ابھرنا بھلا دیا تھا۔ وہ اعظم کی طرف واپس آنے کے بجائے پانی میں ہی بھاگنے کے لئے آگے بڑھ گئی پھر وہاں ہاتھ پاؤں مارنے لگی جیسے ڈوب رہی ہو۔ اعظم نے سمجھ لیا کہ اسے تیرنا نہیں آتا۔ اگر وہ پانی میں جائے گا تو بدحواسی میں وہ اسے بھی لے ڈوبے گی اس نے دوڑ کر رسی کھولی پھر اتنی ہی تیزی سے واپس آ کر کشتی پر بیٹھتے ہوئے چیخنے لگا۔

"مونا کشتی کو پکڑ لو ورنہ ڈوب جاؤ گی۔"

وہ کشتی کو دھکیلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ مگر مونا کشتی کا سہارا نہیں لے رہی تھی۔ بار بار ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ پانی اچھلتا ہوا کشتی پر آ رہا تھا۔ اعظم نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔

"چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو میں تمہارے ہاتھوں سے مرنا نہیں چاہتی میں خود ہی ڈوب کر مروں گی۔"

وہ اسے کھینچتے ہوئے بولا۔ "بچوں جیسی حرکتیں نہ کرو۔ نہیں تو یہ کشی الٹ جائے گی۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کشتی پر کھینچ رہا تھا۔ مگر مونا دوسرے ہاتھ سے کشتی کا سہارا نہیں لے رہی تھی۔ بار بار ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور خود کو اوپر آنے سے روک رہی تھی۔ پانی میں دونوں پاؤں تیزی سے چلا رہی تھی۔ اعظم نے جھلا کر کہا۔ "میں تمہیں ڈوبنے نہیں دوں گا۔ چپ چاپ اوپر آ جاؤ۔ مجھے پھر ظلم پر مجبور نہ کرو۔"

"میں نہیں آؤں گی۔ نہیں آؤں گی۔" وہ چیخ رہی تھی اور اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اعظم نے سمجھ لیا کہ وہ ضد میں آ گئی ہے۔ اس وقت ہوشمندی سے کام نہیں لے گی اس نے اچانک ہی ایک ہلکا سا گھونسہ اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ مونا کے لیے وہ چوٹ زبردست تھی۔ اس کے حلق سے "اونک" کی آواز نکلی۔ پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اعظم نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اسے کشتی پر لٹایا پھر چپو سنبھال کر گھاٹ کی طرف آ گیا۔ وہ دوبارہ کشتی کی رسی کو اسی طرح درخت سے باندھنے کے بعد دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا کر کاٹج کی طرف جانے لگا۔

وہ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی تھی۔ لباس بدن سے چپک رہا تھا اور وہ اس کے بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ ہوش میں نہیں تھی مگر اس کے ہوش اڑا رہی تھی۔ وہ جذبوں

کے موسم میں بھیگتا ہوا کاٹج میں آ گیا۔ ایک صوفے پر اسے آہستگی سے لٹا دیا۔ گرمی الگ ہوئی تو اس سردی لگنے لگی۔ اس نے دانت پر دانت جما کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچا۔ سردی کا موسم ہے' اسے نمونیہ ہو جائے گا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں بستر پر پڑی ہوئی چادر کو اٹھا کر اس کی گرد جھاڑتا ہوا واپس آیا۔ پھر اس چادر کو مونا پر ڈال دیا۔ اسے ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوا اس نے اپنی زندگی میں اپنے بھائی کے سوا اور کسی کا اتنا خیال نہیں کیا تھا۔ آج مونا کے لئے جی چاہتا تھا کہ.......... کہ اپنی جان دے کر اسے گرمی پہنچائے۔ گیلے کپڑوں میں رہ کر وہ یقیناً بیمار پڑ سکتی تھی وہ تیزی سے چلتا ہوا پھر دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں ایک الماری تھی جو مقفل تھی۔ وہ اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

مجبوراً اسے الماری کی کنڈی توڑنا پڑی۔ اندر کچھ مردانہ کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک قمیض پاجامہ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ مونا ہولے ہولے کسما رہی تھی۔ تقدیر کے تماشے بھی عجیب ہیں۔ وہ اسے دوسری بار بے ہوشی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار حسن کی بے ہوشی نے اسے دیوانہ کیا تھا۔ اب بھی دل و دماغ کی یہی حالت تھی۔ جی چاہتا تھا اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے میں چھپا لے۔

مونا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس ماحول کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ پھر اس کی نظر اعظم پر پڑی۔ پھر جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی۔ مگر سر پکڑ کر پھر اسی طرح لیٹنے کے انداز میں گر پڑی۔

اعظم نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "مونا غصہ تھوک دو۔ تم جانا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔"

وہ اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے خاموشی سے تک رہی تھی۔ اعظم نے کہا۔ "یہاں یہی مردانہ کپڑے ہیں۔ دوسرے کمرے میں جا کر انہیں پہن لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کمرے میں نہیں آؤں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ چادر کو اِدھر اُدھر اپنے بدن سے لپیٹ رہی تھی۔ اعظم ان کپڑوں کو سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ مونا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کپڑے اٹھا لئے۔ وہ اعظم کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے

دیکھنا ہی نہ چاہتی ہو۔ وہ کپڑے اٹھا کر دوسرے کمرے کے دروازے پر آئی۔ وہ دروازہ بند ہو جاتا تھا مگر اسے اندر سے بند کرنے کے لیے چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی وہ غصے سے بولی۔

"میں یہاں کپڑے نہیں بدلوں گی۔"

وہ دروازے کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ وہ پیچھے چلی گئی۔ اعظم دروازے کو دیکھنے کے بعد اندر آیا۔ الماری کے پاس رسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ رسیاں اٹھا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر ان رسیوں کو مونا کے قدموں میں پھینکتے ہوئے بولا۔

"میں بہت گرا ہوا آدمی ہوں۔ بھروسے کے قابل نہیں ہوں۔ تم مجھے اس کرسی سے باندھ دو۔ جب اطمینان ہو جائے تو دوسرے کمرے میں جا کر اپنا لباس تبدیل کر لینا۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر رسیاں اٹھا کر اس کے پیچھے آ گئی اعظم نے اپنے دونوں ہاتھ کرسی کے پیچھے کر دیئے۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے ہاتھوں کو باندھنے لگی ڈرنے کے باوجود اس نے بڑی مضبوطی سے ہاتھ باندھے۔ اس طرح قید کر دینے کے بعد ذرا حوصلہ بڑھا۔ اس نے کرسی کے اگلے دو پایوں سے اس کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیئے۔ اب پوری طرح اطمینان ہو گیا۔ وہ مردانہ لباس اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

وہ کمرے میں تنہا رہ گیا۔ اطمینان سے سوچنے لگا کہ وہ اپنی سزا پا رہا ہے جو زیادتی اس نے کی تھی۔ اب صحیح معنوں میں اس کی تلافی ہو رہی ہے۔ وہ سوچنے کے دوران تصور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے گیلے کپڑے اتار کر نچوڑ رہی ہے۔ اب اس کے بدن پر دوسرا لباس ہے اور اپنا لباس نچوڑنے کے بعد اسے دھوپ میں پھیلانے باہر جا رہی ہے۔ کیونکہ باہر جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ انتظار کرنے لگا۔ دیر ہو گئی' اس نے خود کو تسلی دی۔ کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر کپڑے سکھانے میں دیر لگتی ہی ہے۔ مگر ایسی بھی کیا دیر؟ اس کے اندازے کے مطابق آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ اس نے پریشان ہو کر آواز دی۔ اس کے نام کو بڑے پیار سے پکارا۔ کمرہ بند تھا کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ مونا کا نام گونجتا ہوا چکراتا ہوا کھڑکی کے راستے دور تک جا رہا تھا لیکن جواباً کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا۔ کیا وہ سچ مچ چلی گئی ہے۔ پہلے حیرانی تھی۔ ایک گھنٹے بعد پریشانی شروع ہو گئی۔ اس کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کوئی شعر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر یاد

آ رہا تھا۔

”آہٹ پہ کان در پہ نظر تھی کہ ناگہاں‘ آئی صدا کہ پاؤں میں مہندی لگی وہاں............“

آہ جسے چاہا جاتا ہے کیا اس کے پاؤں میں اسی طرح بے مروتی کی مہندی لگ جاتی ہے؟

اس نے پھر ایک بار آواز دی۔ وہ ہوتی تو جواب ملتا۔ محبت اندھی ہوتی ہے‘ یہ اب پتہ چلا کہ محبت بے صدا بھی ہوتی ہے۔اب وہ رسی کی بندشوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگا۔ نازک ہاتھوں کی بندشیں ریشمی زلفوں کی زنجیروں کی طرح مضبوط تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تڑپ رہا تھا اور بندشیں اپنی جگہ اٹل تھیں۔ وہ تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔

کیا ستم ہے وہ کب تک بیٹھا رہے گا؟ وہ چھوٹا سا ویران جزیرہ محبت کی آماجگاہ تھا۔ اب قید خانہ بن گیا تھا۔ کوئی اس کی آواز سن کر وہاں آنے والا نہیں تھا۔ وہ دن رات اسی طرح کرسی پر بیٹھا رہے گا۔ محبت اسے فاقے کرائے گی۔ دریا بیچ بٹھا کر پیاسا مارے گی۔ موسم سرما کے کئی ماہ گذر جائیں گے پھر کوئی بھٹکتا ہوا مسافر یا اس کاٹیج کا مالک آئے گا تو اس کمرے میں اس کرسی پر انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آئے گا۔ اس وقت بھی اس کی بندشیں اپنی جگہ اٹل ہوں گی۔

نہیں......... اس نے جھلا کر سوچا۔ اس طرح تو کوئی کمزور اور بزدل آدمی بھی مرنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ آخری سانس تک اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کر سکتا تھا۔ وہ زور لگا کر اِدھر اُدھر دائیں بائیں ہلنے لگا۔ کرسی کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ دائیں بائیں گرنا چاہتی تھی۔ پھر اپنی جگہ ٹھہر جاتی تھی کبھی کبھی آگے بڑھتی تھی۔ اس طرح وہ کرسی پر بیٹھا مینڈک کی طرح پھدک کر بند دروازے تک پہنچ رہا تھا۔ دو چار قدم کا فاصلہ تھا مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے سردی کے موسم میں بھی پسینہ نکل آیا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح دروازہ کھول کر پھدکتا ہوا باہر تک پہنچ جائے۔ باہر اس بندش سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ آ سکتا تھا۔

وہ دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ دروازے کا ہینڈل اس کے دائیں طرف تھا۔ اس نے دائیں طرف سر جھکا کر کسی طرح دانتوں کے درمیان اس ہینڈل کو دبوچ لیا۔ پھر

اس نے سر کو نیچے جھکایا۔ ہینڈل بھی نیچے ہوا۔ دروازہ کھٹ کر آواز کے ساتھ ذرا سا کھل گیا۔ ذرا سا اس لئے کہ کھلنے کے راستے پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پھر پھدک کر ایک طرف ہٹنے لگا۔ وہاں سے ہٹ جانے کے بعد دروازہ اسی طرح ذرا سا کھلا رہا۔ کیونکہ اسے کھولنے والے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے تھے۔

اس دروازے کو تو اب ہوا کا کوئی جھونکا ہی کھول سکتا تھا۔ یا پھر ہوا کا جھونکا اسے ایک جھٹکے سے دوبارہ بند کر سکتا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔ وہ مونا سے زیادہ اپنے آپ پر جھنجلا رہا تھا کہ اس نے ایک لڑکی پر اس حد تک اعتماد کر لیا۔ کوئی احمق بھی اس طرح اپنے ہاتھ پاؤں نہیں بندھواتا۔ ویسے بات کچھ اور تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے کہے گا تو اسے اس کی شرافت کا یقین آ جائے گا۔ وہ اسے نہیں باندھے گی۔ یا پھر صرف ہاتھ باندھ کر تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر جائے گی پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولے گی۔

”تم واقعی شریف آدمی ہو۔ تم نے سر راہ مجھے نقصان پہنچایا لیکن اس ویرانے میں میری عزت و آبرو کے محافظ بنے رہے۔“

آہ......... اس خام خیالی نے اسے بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ تو کشتی میں بیٹھ کر جا رہی ہو گی۔ شاعر حسن والوں کو سنگدل کہتے ہیں تو درست کہتے ہیں۔ وہ بھی نہیں سوچے گی کہ وہ اس طرح بندھا رہے گا اور بھوکا پیاسا مر جائے گا۔ آدمی کے پاس جب کوئی نہیں ہوتا یا اس کی ساری جدوجہد ناکام ہو جاتی ہے تو اس کے پاس صرف خیالی گھوڑے رہ جاتے ہیں‘ جو ناکامی کے میدان میں امید کی دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔

پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا ہے۔ اس دھک دھک کے ساتھ کہیں فرش پر کھٹ کھٹ سینڈل بج رہے تھے۔ اس ویران جزیرے کے ویران کاٹیج میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر بجنے والی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ آواز سوچ سوچ کر تھم تھم کر آ رہی ہو۔

پھر اس کے سامنے دروازہ کھل گیا۔ نگاہوں کے سامنے وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور ایسے پچھتاوے کے آثار تھے جو جانے والے قدموں کو واپس لے آتے ہیں۔ اعظم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے نظریں ملیں

پھر وہ اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر رسیاں کھولنے لگی۔ اعظم نے اطمینان کی سانس لی وہ محبت اور اعتماد کے آزمائشی مرحلے سے گزر چکا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مونا کھانے کا سامان سمیٹ کر باسکٹ میں رکھ رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مونا تمہارا شکریہ! تم نے یہاں مجھے بے بسی کی موت سے بچا لیا۔"

خیال تھا کہ بات سے بات نکلے گی مگر وہ چپ رہی۔ یہ لڑکیاں بعض حالات میں بڑی پُراسرار بن جاتی ہیں۔ سمجھنا چاہو تو سمجھ میں نہیں آتیں۔ کبھی کتاب کی طرح کُھل جاتی ہیں۔ کبھی خاموشی کی سیپ میں موتی کی طرح بند ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنا باسکٹ اٹھا کر واپس جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اعظم نے پوچھا۔

"کیا واپس جاؤ گی؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اعظم تیزی سے چلتا ہوا اس سے پہلے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ "مونا! میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ہٹ جاؤ مجھے جانے دو۔"

"تمہارے کپڑے ابھی گیلے ہیں۔ کیا تم یہ مردانہ لباس پہن کر واپس جاؤ گی؟"

"میں باہر کپڑے سوکھنے کا انتظار کروں گی۔"

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ مونا اس کے سامنے سے گزرتی ہوئی باہر آ گئی۔ وہ پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "مجھے اپنی صفائی پیش کرنے دو۔ اس رات تم جھاڑیوں کے دوسری طرف سے فٹ پاتھ پر چلی آ رہی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ آنے والی کوئی لڑکی ہو گی۔ بہرحال آنے والا کوئی بھی ہوتا تو میں اسے ہر حال میں روکنا چاہتا تھا۔"

وہ غصے سے پلٹ کر بولی۔ "تاکہ تم سنار کا شوکیس توڑ سکو' تم چور ہو تم ڈاکو ہو۔ کاش کہ تمہاری پیشانی پر یہ سب کچھ لکھا ہوتا۔ پھر میں دھوکہ تو نہ کھاتی۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ وہ شوکیس میں نے نہیں توڑا تھا۔ میں چور نہیں ہوں۔ دراصل وہ کوئی دوسرا تھا۔"

"اب تم کسی دوسرے پر الزام لگاؤ مجھے یقین دلانے کے لئے کوئی دوسری من گھڑت کہانی سنا دو۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "مونا شک کا علاج تو کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ ویسے میں یہاں سے واپسی پر تمہیں اپنے گیراج لے جاؤں گا۔ وہاں اپنا کاروبار دکھاؤں گا تب تمہیں یقین آئے گا کہ مجھ جیسا حلال کی روزی کمانے والا کبھی چوری نہیں کر سکتا۔"

"بہت سے لوگ راتوں رات امیر بننے کے لئے حلال کے ساتھ حرام کی کمائی بھی شامل کر لیتے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "ہاں میں حرام کی کمائی کھاتا ہوں۔ میں چور ہوں۔ میں بدمعاش ہوں۔ تمہیں اغوا کر کے اس جزیرے میں لے آیا ہوں۔ تمہیں لوٹ کھسوٹ رہا ہوں اور تم بے چاری فریاد کئے جا رہی ہو۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اس سے دور چلا گیا۔ دور ایک درخت جڑ سے اکھڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ وہ وہاں جا کر مونا سے منہ پھیر کر اس درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان پھر گفت و شنید کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس نے دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا کہ اب وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دور تک پھیلے ہوئے سوکھے پتے کراہنے لگے۔ وہ قریب آ رہی تھی۔ سوکھے پتوں کی سسکیاں سنا رہی تھیں کہ اس کے اندر پچھتاوا سسک رہا ہے۔

پھر اسے اپنے پیچھے مونا کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "مجھے بتاؤ وہ کون تھا؟"

وہ بولنا چاہتا تھا۔ پھر دماغ نے سمجھایا۔ خبردار نعیم کا ذکر نہ کرنا۔ اس کے ذکر سے اس کے پاگل پن کی بات چلے گی پھر وہ کہے گی کہ ایسے پاگل کو پاگل خانے میں رکھنا چاہیے۔ پُر امن شہریوں کے لئے اسے خطرہ نہیں بنانا چاہیے۔ اگر وہ مونا کی بات نہیں مانے گا تو وہ قانون کے محافظوں تک یہ شکایت پہنچا دے گی۔

اعظم کے دل نے کہا۔ "نہیں مونا ایسا نہیں کرے گی۔"

اس کے دماغ نے کہا۔ "وہ غصہ میں ایسا کر سکتی ہے' جیسا کہ ابھی غصے کی حالت میں اسے باندھ کر چلی گئی تھی بے شک وہ محبت کرتی ہے۔ مگر آپے سے باہر ہو کر سزا بھی دیتی ہے۔ دانشمندی یہ ہے کہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں کرنی چاہیے۔"

مونا نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں جواب دو وہ کون تھا؟"

"جواب دوں گا تو تمہارے لئے وہ من گھڑت کہانی ہوگی۔"

"تم جو کہو گے میں یقین کرلوں گی۔"

اعظم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "وہ ایک شریف آدمی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس پر دورہ پڑتا ہے اسے جو چیز پسند آتی ہے اسے حاصل کرنے کے لئے قانون کی حد سے گزر جاتا ہے۔ پھر وہ نارمل ہو جاتا ہے۔ وہ بہت معصوم ہے بہت مظلوم ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ شو کیس توڑنے کے دوران پکڑا جائے۔ میں نے اس کو بچانے کے لئے تم پر ہاتھ اٹھایا۔ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ میں کسی لڑکی پر ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔"

"پھر تو تمہیں مجھ سے دور رہنا چاہئے تم میرے قریب کیوں آئے ہو؟"

"دل سے مجبور ہو کر۔ پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں نے جو ظلم کیا اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے لئے بوجھ اٹھا کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ پھر تم سے ملنے کے دوران پتہ چلا کہ میں صرف ضمیر سے نہیں دل سے بھی مجبور ہو کر تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ مونا میں سچ کہتا ہوں کہ تمہاری چاہت میں' میں نے ساری دنیا بھلا دی ہے'..........جب تم سامنے نہیں ہوتی ہو تب بھی سوتے جاگتے ہر گھڑی ہر جگہ تم مجھے دکھائی دیتی ہو؟"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ اس کی اپنی ہی باتیں دماغ میں گونج رہی تھیں۔ دوسری طرف سے جواب نہ ملے تو آدمی اپنی ہی آواز کی بازگشت میں بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ وہ خاموش تھی سارا جزیرہ خاموش تھا۔ پھر اتنی ہی خاموشی سے مونا نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر اپنا سر اس کے دوسرے شانے پر رکھتی ہوئی بولی۔

"تم وہ کہہ رہے ہو جو مجھ پر گزرتی ہے۔ مجھے ہر پل ہر جگہ تم ہی نظر آتے ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ دیکھو پھر آ گئی ہوں نا؟"

اس کے دھیمے سے لہجے میں محبت کا بے پناہ درد تھا۔ اعظم نے گھوم کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ جنگل ہرا ہو گیا۔ خاموش جزیرہ دھڑکنوں کی زبان بول رہا تھا۔

☆======☆======☆

واپسی میں گیراج بند ہو چکا تھا۔ وہ کار کو گیراج کے سامنے چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا۔ اس نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سعید خان نہیں تھا۔ شاید کہیں باہر

گیا تھا۔ پھر اس نے دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے قریب ہی نعیم ایک کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ کمرے میں بلب کی روشنی تھی اور اس روشنی میں سونے کی ایک انگوٹھی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

وہ سوچ میں اس طرح محو تھا کہ اسے کھڑکی کے پاس اعظم کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکا۔ اعظم نے پہلی بار بھائی کو اس طرح کسی سوچ کی گہرائی میں ڈوبے دیکھا تھا۔ وہ انگوٹھی اسے شاید کوئی سپنا دکھا رہی تھی۔ اعظم کو اس پر بڑا پیار آیا۔ اس وقت اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ نیم پاگل ہے۔ وہ بہت ہی معصوم اور پیار کرنے والا انسان نظر آ رہا تھا۔

دنیا کچھ کہے وہ اپنے بھائی کو پاگل نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اگر دو چار ماہ میں کبھی اس پر دورہ پڑ جاتا تھا اور وہ ضدی اور بدمزاج نظر آتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے پاگل سمجھ لیا جائے۔ اگر لوگ سمجھنا چاہیں تو دورہ کس پر نہیں پڑتا؟ ہماری دنیا میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جو اپنے کھانے تک پہنچنے کے لئے حالات کے تار کانٹوں سے گزرتے ہیں۔ کبھی کسی پر غصہ دکھاتے ہیں۔ کبھی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے کی روٹی چھین لیتے ہیں۔ اکثر لوگ اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے ہوش کی حدوں سے گزر کر ظالم بن جاتے ہیں مگر کوئی انہیں پاگل نہیں کہتا۔ اسی لئے اعظم اپنے بھائی کو پاگل نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو نعیم ایک دم سے چونک گیا۔ پہلے اس نے اس انگوٹھی کو جلدی سے اپنی مٹھی میں بند کیا۔ جیسے کوئی اسے چھیننے آ رہا ہو۔ ویسے یہ خیال غلط تھا۔ نعیم جیسے ضدی جوان سے اس کی پسند کی چیز کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ اس نے اعظم کو دیکھتے ہی انگوٹھی کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اعظم نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟"

"کچھ نہیں.......... میں بھلا کیا چھپاؤں گا؟"

"کوئی چیز تمہاری مٹھی میں تھی۔ وہ جیب میں چلی گئی۔"

وہ مسکرانے لگا۔ اپنے سینے پر جیب کے اوپر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "وہ......... بس ایک انگوٹھی ہے۔"

"کسی نے دی ہے؟"

"نہیں.......... میں کسی کو دینا چاہتا ہوں۔" نعیم کے چہرے پر بڑی تازگی تھی جیسے

کسی کو انگوٹھی دینے کے خیال سے زندگی کی نئی حرارت مل رہی ہو۔

اعظم نے قریب آ کر پوچھا۔ ”یار مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ میں تمہارا صرف بھائی نہیں، دوست بھی ہوں۔“

وہ منہ اٹھا کر چھت کی طرف گھور رہا تھا جیسے وہاں کسی کی صورت نظر آ رہی ہو۔ پھر وہ دور کہیں سے بولا۔ ”ایک لڑکی ہے‘ بہت اچھی ہے بہت پیاری ہے۔ میں نے اسے سنار کی دکان پر دیکھا تھا۔ وہ انگوٹھی کی قیمت معلوم کر رہی تھی۔“

اعظم نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا اسی سنار کی دکان پر‘ جس کا شوکیس تم نے توڑا تھا؟“

”ہاں میں نے اسی دکان میں اسے دیکھا تھا پتہ نہیں دکاندار نے اسے انگوٹھی کی کتنی قیمت بتائی؟ لڑکی نے پرس کھول کر روپے گنے‘ شاید کم پڑ رہے تھے وہ معذرت چاہنے کے بعد دکان سے چلی گئی۔ اپنی پسند کی انگوٹھی خرید نہ سکی۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ دکاندار اس انگوٹھی کو شوکیس میں واپس رکھ رہا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ ہم اپنی ضرورت اور پسند تک کیوں نہیں پہنچ پاتے؟ اس لڑکی اور انگوٹھی کے درمیان شیشے کی ایک دیوار تھی جسے میں ایک گھونسے میں توڑ سکتا تھا۔“

”اوہ۔ نعیم تمہیں دوسروں کی ضرورت اور پسند کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔“

”میں نے پہلے کبھی کسی کے لئے نہیں سوچا مگر اس کے لئے آپ ہی آپ سوچنے لگا ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“

”پتہ نہیں۔ میں اس وقت شوکیس کے پاس کھڑا فیصلہ کرتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں نے سوچا۔ دن کے وقت شوکیس توڑنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے مجھے اس لڑکی کا پتہ معلوم کرنا چاہیے۔ پھر میں اسے اس پتے پر انگوٹھی پہنچا دوں گا۔ مگر سوچتے سوچتے دیر ہو گئی۔ وہ ٹریفک کے ہجوم میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آئی۔“

”تو پھر یہ قصہ ختم ہی کر دیتے۔ وہاں سے انگوٹھی چرانے کی کیا ضرورت تھی؟“ اعظم نے پوچھا۔

”ہاں جب وہ نہیں ملی تو میں نے انگوٹھی کا خیال چھوڑ دیا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے نادانستگی میں میری آنکھیں اسے تلاش کر رہی تھیں۔ دو دن بعد ہی اچانک نظر آ گئی۔ وہ ایک بس میں سوار ہو رہی تھی میں بھی اس بس میں سوار ہو گیا۔ تمام راستے اس کی پشت نظر آتی رہی پھر ایک اسکول کے سامنے اتر گئی۔ میں بھی اتر گیا۔ وہ ایک پرائمری اسکول تھا۔ سامنے ایک دکاندار سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔“

اعظم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اسکول میں پڑھاتی ہے؟ کس اسکول میں؟“

”رجب علی پرائمری اسکول.........“

اعظم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے پریشان ہو کر بھائی سے پھر پوچھا۔ ”تم نے اس لڑکی کا نام اور پتہ معلوم کیا ہو گا؟“

”میں کس سے معلوم کرتا۔ اگر دکاندار سے پوچھتا تو وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں کسی لڑکی کا نام و پتہ کیوں معلوم کر رہا ہوں؟“

”تم نے اس لڑکی کا پیچھا کیا ہو گا؟“

”ہاں جب اسکول سے چھٹی ہوئی تو میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ بس میں گلشن پلازہ گئی تھی مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے سوچا جب انگوٹھی حاصل کر لوں گا تو پھر وہاں جا کر اس کا سامنا کروں گا۔“

اعظم کو اطمینان ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”تو پھر یہ انگوٹھی اب تک اپنے پاس کیوں رکھے ہوئے ہو؟“

نعیم نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ نہیں ملی اس لیے کہ وہ گلشن پلازہ میں نہیں رہتی ہے۔ اس روز مجھے دھوکہ ہوا تھا۔ شاید وہ وہاں اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی تھی۔ میں اس روز سے آج تک وہاں کے چکر لگاتا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ پھر اسکول کی طرف جانا چاہیے۔ آج وہاں گیا تو اسکول کی عمارت ٹوٹی ہوئی تھی پتہ چلا کہ اسکول کی چھت بیٹھ گئی تھی۔ اب جب تک اس عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے گا۔ اس وقت تک وہاں تعلیم کا سلسلہ بند رہے گا۔“

پھر ایک بار اعظم کا دل ڈوبنے لگا۔ مونا نے اسے بتایا تھا کہ اسکول کی از سر نو تعمیر ہو رہی ہے۔ نعیم بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا نہیں......... اس اسکول میں

اور بھی لڑکیاں پڑھاتی ہوں گی۔ نعیم نے مونا کے لئے نہیں کسی دوسری ہستی کے لئے وہ انگوٹھی حاصل کی ہے۔

اعظم تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے نعیم سے پوچھا۔ "جب پہلی بار تم اس لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے اسکول تک گئے تو کس بس اسٹاپ سے سوار ہوئی تھی؟"

"بفرزون کے اسٹاپ سے۔ کل میں بفرزون کے علاقے میں جاؤں گا۔"

اعظم کی عجیب حالت تھی۔ کبھی مونا کا شبہ ہوتا تھا اور وہ شبہ کبھی ختم ہو جاتا تھا اور کبھی یقین میں بدل جاتا تھا۔ اور اب یقین ہو رہا تھا۔ کیونکہ بفرزون کے اسٹاپ سے سوار ہو کر اس پرائمری اسکول تک جانے والی صرف مونا ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے نصیحت کے طور پر کہا۔ "نعیم کسی لڑکی کے پیچھے یوں نہیں گھومنا چاہئے۔ اس طرح وہ بدنام ہو جائے گی۔"

"میں نے اسے بدنام کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔"

"پھر بھی بفرزون نہیں جانا چاہئے۔"

"میں جاؤں گا۔ اسے اس طرح تلاش کروں گا کہ وہ بدنام نہیں ہو گی۔ تم مجھے منع کیوں کر رہے ہو' میں کوئی مجنوں تو نہیں ہوں کہ لیلیٰ لیلیٰ پکارتا پھروں گا۔"

"میں اس لئے منع کر رہا ہوں کہ شاید وہ شادی شدہ ہو یا کسی کی منگیتر ہو یا پھر کسی سے محبت کرتی ہو۔"

نعیم نے گھونسہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں اس محبت کرنے والے کا سر توڑ دوں گا۔"

اعظم کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے بھائی کو دیکھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اور مونا کی محبت میں یہ خطرناک موڑ بھی آئے گا اور نعیم اس کا طالب بن کر راستے میں کھڑا ہو جائے گا۔ سوچنے کے دوران پھر یہ بات دماغ میں آئی کہ نعیم مونا کے پیچھے نہیں بھاگ رہا ہے۔ وہ لڑکی کوئی اور ہے۔

اس کے تصورات میں وہ رات آئی' جب مونا فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ ایسے وقت نعیم اس کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے کھینچتا ہوا لے گیا تھا۔ کیا نعیم نے اس وقت مونا کو نہیں دیکھا ہو گا؟ اس نے نعیم سے یہ سوال کیا۔ "کیا اس رات تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو میرا گھونسہ کھا کر بے ہوش ہو گئی تھی؟"

نعیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں' بس میں نے یہی دیکھا کہ کوئی لڑکی فٹ پاتھ

پر پڑی ہے۔ تم اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

"مگر تم نے مجھے پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس کے بعد تو تم نے اس کی ایک آدھ جھلک دیکھی ہو گی؟"

"اوں ہونہہ۔ اگر کوئی خاص بات ہوتی تو ادھر ضرور دیکھتا۔ اس وقت تو میں گھبرایا ہوا تھا۔ دکان کا مالک میرے ڈر سے چیخنا بھول گیا تھا۔ مگر مجھے پھر بھی ڈر تھا کہ وہ کسی وقت بھی چیخنے لگے گا۔ اس بدحواسی میں مجھے صرف تمہارا خیال تھا۔ میں بھلا اس لڑکی کو کیا دیکھتا؟ مگر......... مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ کون تھی وہ لڑکی؟"

وہ جواب کیوں دیتا؟ جتنے شبہات تھے وہ یقین کی طرف لوٹ آئے تھے۔ پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مونا کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اگر دیکھ لیتا تو اسی وقت یہ بات سمجھ میں آ جاتی کہ جس کے لئے وہ شیشے کی دیوار توڑ کر انگوٹھی لایا ہے' وہی فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

مگر تقدیر کو تو تماشے دکھانے سے مطلب ہے۔ کبھی بھائیوں کے درمیان یہ تقدیر ایسی محبت پیدا کرتی ہے کہ ایک بھائی دوسرے کے پاگل پن کو قانون کی نظروں سے چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ پاگل پن میں جو غلطیاں یا جرائم کرتا ہے۔ اس کے لئے بڑا بھائی معافیاں مانگتا ہے یا پھر ان جرائم کو چھپانے کے لئے خود بھی جرم کر بیٹھتا ہے۔ یہ لہو کے رشتوں میں محبت کی انتہا ہے۔ اب ان ہی محبت بھرے رشتوں کے درمیان مونا ایک اہم سوال بن گئی تھی۔

اب کیا ہو گا؟ کیا نعیم اپنی ضد سے باز آ جائے گا؟ یہ تو ممکن نہ تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ اعظم مونا کو چاہتا ہے۔ اس کے راستے کا تار کانٹا ہے تو اس پر دورہ پڑنا یقینی ہو جاتا۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"نعیم! اخلاقی تقاضے یہ ہیں کہ ہم کسی کو محبت سے طلب کریں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اسے محبت سے حاصل کرو گے۔ چھیننے اور جھپٹنے کی کوشش میں اس لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں' وہ مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ مگر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں میں کیسے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اب تو مجھے صرف وہی لڑکی نظر آ رہی ہے۔ میں بس یہی چاہتا ہوں کہ کسی طرح یہ انگوٹھی اسے پہنا دوں۔"

وہ جیب سے انگوٹھی نکال کر اسے بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔ بلب کی تیز روشنی میں اعظم بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر سونے کی چمک اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر تازہ ہوا کے جھونکے اس کے الجھے ہوئے دماغ کو سکون نہ پہنچا سکے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا گیراج کے پاس آیا۔ وہاں کار کھڑی ہوئی تھی۔ دل نے کہا۔ ابھی گاڑی میں بیٹھ کر مونا کے پاس پہنچ جائے اور یہ بتا دے کہ محبت ایک بہت ہی سخت آزمائشی مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

پھر اس نے کار میں بیٹھ کر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پیدل چلتے وقت زیادہ تفصیل سے سوچا جاتا ہے۔ ابھی اسے بہت کچھ سوچنا تھا اور کسی ایک نتیجے پر پہنچنا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے جو پہلا سوال اس کے دماغ میں آیا۔ وہ یہ تھا کہ وہ مونا سے کیا کہے گا؟ کیا اسے بتا دے کہ جو انگوٹھی وہ خرید نہ سکی تھی۔ اس کا بھائی اسے وہی انگوٹھی پہنانا چاہتا ہے۔

نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ محبت وہ کر رہا تھا اور انگوٹھی اس کا بھائی پہناتا' یہ بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ پھر یہ کہ مونا اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ کوئی مذاق تو نہیں تھا کہ اس سے دل لگی چھوڑ کر اس سے دل لگی شروع کر دیتی۔ وہ مونا کو کچھ کہنے سے پہلے اس کی طرف سے ملنے والے جواب کو سمجھتا تھا۔

آہ......... بھائی بھی عزیز تھا۔ مونا بھی دل میں دھڑکتی تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ابھی نعیم سے یہ کھل کر کہہ دیتا کہ باز آ جاؤ' مونا میری محبت ہے۔ تو یہ اس کے لئے چیلنج ہو جاتا اور مونا سے تو وہ کبھی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی محبت کسی دوسرے کے حوالے کر دے۔ بھائی کو بہت کچھ دیا جا سکتا ہے' اپنی عورت کی محبت نہیں دی جا سکتی۔ ایسے ہی مرحلوں پر پہنچ کر زر' زن اور زمین فساد کا باعث بنتی ہیں' اور اب دو بھائیوں کے درمیان فساد کی یہ آندھی اٹھنے والی تھی۔

وہ چلتے چلتے رک گیا' آگے جو راستہ تھا۔ وہاں مونا تھی اور پیچھے وہ بھائی کو چھوڑ آیا تھا۔ نہ جائے رفتن' نہ پائے ماندن' فیصلے کی اس گھڑی میں وہ نہ آگے جا سکتا تھا' نہ پیچھے لوٹ سکتا تھا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن اس نے سعید خان کے سامنے اس اہم مسئلے کو پیش کیا۔ سعید خان سنجیدگی سے اعظم کی داستان محبت اور نعیم کی مداخلت کی کہانی سنتا رہا۔ پھر وہ بولا۔

"میں سمجھتا تھا کہ نعیم کا دماغ چل جاتا ہے۔ مگر تم تو اس سے زیادہ پاگل نظر آ رہے ہو۔"

"کیا میں پاگل ہوں؟"

"سوری میں غلط کہہ گیا۔ تمہیں پاگل نہیں گدھا کہنا چاہیے۔ مونا پر حملہ کرنے کے بعد تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا تم کامیاب حملہ آور کی طرح تمغے حاصل کرنے گئے تھے؟"

"نہیں۔ میرا ضمیر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ مونا کو میری ذات سے جو تکلیف پہنچی' اس کے بدلے میں اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میں ہمدردی کے جذبات لے کر گیا تھا' بعد میں محبت ہو گئی۔"

"جانے دو محبت کو' جب تمہارا بھائی اس میں دلچسپی لے رہا ہے تو اسے بہلنے دو۔"

"سعید! یہ میرا دل ہے' موٹر گیراج نہیں کہ آج ایک کار آئی' کل اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ کیا تم محبت کو نہیں سمجھتے؟"

سعید خان نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں ایسی محبت کو نہیں سمجھتا جو دو بھائیوں کے درمیان نفرت پیدا کر دے۔"

اعظم بے بسی سے منہ تکنے لگا۔ کیونکہ وہ درست کہہ رہا تھا۔ وہ محبت نفرت پیدا کرنے والی تھی۔ سعید خان نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کہا۔

"یہی مشورہ میں نعیم کو دے سکتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلہ میں تم ہوش مند ہو' تم دل پر پتھر رکھ کر یہ بازی ہار سکتے ہو' نعیم کو ہارنے کے لئے کہا جائے گا تو پھر اس پر دورہ پڑے گا۔"

اعظم نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "میں ہر پہلو پر غور کر چکا ہوں تم جانتے ہو کہ میں نعیم کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں لیکن میری قربانیوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ یہ تو مونا کی پسند پر ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہے جو اپنے اصول نہیں بدلتی' پھر زندگی کا ساتھی کیسے بدلے گی۔ ہم لباس تو نہیں ہیں کہ وہ ایک کے بعد دوسرے کو پہن لے گی۔"

"بعض اوقات لڑکیاں بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں اگر تم مونا کو اپنی مجبوریوں اور نعیم کی معصومانہ دیوانگی اور اس کی شرافت کا یقین دلاؤ گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ نعیم کو قبول کر لے' نعیم میں کسی بات کی کمی نہیں۔"

اعظم کا دل ڈوبنے لگا۔ اس لمحہ پتہ چلا کہ بھائی کے لئے جان دینا آسان ہے مگر دل دینا مشکل ہے۔ دل کا لین دین صرف محبوبہ سے ہوتا ہے اور دوسرے تمام رشتوں کے لئے جان حاضر رہتی ہے۔ اس نے کہا۔

"سعید! میں مونا کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ وہ کبھی نعیم کو قبول نہیں کرے گی۔"

"تم مونا کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کوشش اور آزمائش سے پہلے ہی باتیں بنا رہے ہو۔ تم دو دن کے پیار میں مونا کے مزاج کو سمجھنے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ جبکہ پیدا کرنے والے ماں باپ بھی اپنی اولاد کو اس کے بڑھاپے تک نہیں سمجھ پاتے۔"

سعید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بولتے بولتے رک گیا۔ کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ ان کے سامنے نعیم کھڑا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا اس نے ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجاتے ہوئے جیب سے انگوٹھی نکالی۔ پھر اسے فضا میں اچھالتے ہوئے بولا۔ "ہاہا آخر وہ مل ہی گئی۔"

اعظم تڑپ کر کھڑا ہو گیا سعید نے بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "بھئی کون مل گئی ہے۔ بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟"

وہ انگوٹھی کو پھر ایک بار اچھال کر کیچ کرتے ہوئے بولا۔ "وہی لڑکی جسے میں کئی دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔ کیا اعظم نے تمہیں نہیں بتایا؟"

سعید خان نے کہا۔ "اچھا وہ لڑکی جس کے لئے تم نے یہ انگوٹھی چرائی ہے۔"

"ہاں وہی۔ اس کا نام مونا ہے۔ آج میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر صدر تک لے گیا تھا۔"

اعظم نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ "کیا وہ تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی؟"

"ہاں۔ اگر اکیلی ہوتی تو شاید نہ بیٹھتی۔ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہیں صدر تک جانے کے لئے بس میں جگہ نہیں مل رہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا تو اس کی والدہ دعائیں دیتی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ آج وہ پیچھے تھی کل وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے گی۔ ہاہاہا.........."

اعظم اور سعید خان نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ پھر سعید خان

نے پوچھا۔

"تم کیسے توقع کرتے ہو کہ وہ پیچھے سے آگے آئے گی؟"

اس نے انگوٹھی کو کوٹ کے کالر پر گھسا کر چمکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے باتیں کی تھیں۔ وہ بہت اچھی باتیں کرتی ہے۔"

"تم نے اس کی ماں کے سامنے بھلا کیا باتیں کی ہوں گی؟"

وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنے مطلب کی ہی بات کی تھی۔ اس کی ماں راضی ہو گئی۔ کل میں اس کے گھر جا کر اسے انگوٹھی پہناؤں گا۔"

"ایں؟" اعظم نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ ایک دن کی ملاقات میں انگوٹھی پہننے پر راضی ہو گئی؟"

نعیم اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے کرتے رک گیا۔ اعظم کو خالی خالی نظروں سے یوں تکنے لگا جیسے دماغی آنکھوں سے کچھ دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

"سامنے تار کانٹے نہ ہوں تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا' نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اعظم آگے بڑھ کر اس کے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ سعید خان نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو وہ اپنے خوابوں میں مست ہے' اسے ڈسٹرب نہ کرو۔"

"مگر سعید.........."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ وہ اپنے سامنے تار کانٹے نہیں دیکھ رہا ہے۔ کیا تم کانٹا بننا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟"

"اور میں بتا چکا ہوں کہ حالات کے ساتھ لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔"

"مونا ایسی نہیں ہے۔ میں نے اس کی گلیوں کے کتنے ہی چکر لگائے ہیں تب کہیں جا کر وہ موم ہوئی ہے۔"

"مونا کیسی ہے' یہ تم دونوں بھائیوں کے مختلف بیانات سے صاف ظاہر ہے۔"

اعظم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگا۔ سعید نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟ ابھی یہ سارا سامان نئے مکان میں منتقل کرنا ہے۔"

وہ دروازے سے پلٹ کر بولا۔ "میرے خوابوں کا محل چکنا چور ہو رہا ہے۔ مجھے اور

کسی مکان سے دلچسپی نہیں ہے۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر برآمدے میں چلتا ہوا' سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ تینوں گیراج کے اوپر لاوارثوں کی طرح رہتے رہتے بیزار ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے شہر سے باہر ایک پُرسکون علاقے میں ایک خوبصورت سا کاٹیج خریدا تھا۔ اس سلسلے میں سعید خان نے زیادہ دلچسپی لی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا کام اتنا رہ گیا تھا کہ وہ سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے میں مدد کرتے۔ لیکن نعیم خواب میں محل تعمیر کر رہا تھا اور اعظم اپنے خواب کے محل کو مسمار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

وہ خواب کی صحیح تعبیر معلوم کرنے کے لئے مونا کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کی والدہ نے دروازہ کھولا۔ اعظم کو دیکھتے ہی خوش ہو کر بولیں۔"ارے بیٹا تم ہو۔ آؤ بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔ ہم ابھی کھانا شروع کر رہے تھے۔"

"میں تو کھا چکا ہوں۔" وہ اندر آ کر بولا۔ حالانکہ بھوک لگ رہی تھی۔ مگر دل ایسے مکان میں پانی بھی نہیں پینا چاہتا تھا۔ جس کے مکین کی وفا ڈگمگاتی ہو۔ وہ خاتون کے ساتھ ایک کمرے میں آیا۔ وہاں مونا دسترخوان پر کھانے کی پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ اعظم کو دیکھتے ہی خوشی سے کِھل گئی۔ پیار کا خاموش اظہار ہی سارے شکوک دھو ڈالتا ہے۔ وہ گڑبڑا گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے شک کا اظہار کیسے کرے؟

وہ خاتون کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا"میں کھا کر آیا تھا۔ مگر کھانا دیکھ کر پھر بھوک لگ رہی ہے۔"

خاتون نے کہا"چلو پھر بسم اللہ کرو۔"

وہ آستین چڑھانے لگا۔ مونا نے گھور کر پوچھا"کیا ہاتھ دھوئے بغیر کھانا شروع کر دیتے ہو۔"

وہ جھینپ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ مونا بھی اٹھ کر اس کی راہنمائی کے لیے غسل خانے تک آئی۔ اپنے مطلب کی بات چھیڑنے کے لیے کبھی اچانک ہی کوئی موقع مل جاتا ہے۔ جب وہ صابن بڑھانے لگی تو اعظم نے اس کے گورے گورے ہاتھوں کو تھام کر کہا"تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔"

وہ شرماتے مسکراتے ہوئے بولی"تمہارے لیے خوبصورت ہوں گے۔ میری سمجھ سے تو یہ ہاتھ اتنے مضبوط ہیں کہ رسی کی گرہ مضبوط باندھتے ہیں۔ تمہیں تجربہ تو ہو چکا

ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں' اگر تم سونے کی ایک انگوٹھی پہن لو تو ہاتھوں کی خوبصورتی اور بڑھ جائے گی۔"

"چلو تم کہتے ہو تو کل تمہیں ایک انگوٹھی پہن کر دکھاؤں گی۔"

اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔"خریدنے والی ہو یا خرید چکی ہو؟"

"ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ایک صاحب کی مہربانی ہوئی تو کل خرید ہی لوں گی۔"

"کون ہیں وہ صاحب؟"

"ہائے اعظم! تم سے باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے وہ تم ہی تھے۔ ان صاحب کا لہجہ تم سے بہت ملتا ہے۔ میں امی کے ساتھ ان کی گاڑی میں صدر گئی تھی۔ ہم پچھلی سیٹ پر تھے اور وہ صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ مجھے ان کی پشت نظر آ رہی تھی۔ پشت کی طرف سے بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے تم آگے بیٹھے ڈرائیو کر رہے ہو۔"

اعظم کے دل میں آیا کہ بھائی کا رشتہ ظاہر کر دے۔ پھر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ پہلے اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ مونا کس حد تک نعیم سے متاثر ہے اور اس سے انگوٹھی کیوں لے رہی ہے؟ وہ بظاہر شوخی سے بولا۔"اچھا تو تم اسے اعظم سمجھ کر اس کی انگوٹھی قبول کرو گی؟"

وہ ناراض ہو کر بولی۔"فضول باتیں نہ کرو' نہیں تو یہ صابن دانی سر پر مار دوں گی۔"

وہ صابن دانی پٹخ کر وہاں سے چلی گئی۔ انگوٹھی لینے والی بات کھل نہ سکی۔ وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آیا۔ پھر خاتون کے پاس بیٹھ گیا۔ مونا نے اس کی طرف سالن کی ڈش بڑھاتے ہوئے کہا۔"امی! ذرا اعظم کو انگوٹھی والی بات بتا دیں۔"

خاتون نے ممتا بھری مسکراہٹ سے کہا۔"تمہیں تو انگوٹھی پہننے کا خبط ہے۔ خدا بھلا کرے وہ لڑکا تو بہت ہی شریف اور ایماندار لگ رہا تھا"

"کون لڑکا؟"اعظم نے انجان بن کر پوچھا۔

"کل اس نے صدر تک ہمیں اپنی گاڑی میں پہنچایا تھا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ وہ مونا کو ایک سنار کی دکان میں دیکھ چکا ہے۔ مونا نے وہاں ایک انگوٹھی پسند کی تھی۔

قیمت زیادہ تھی اس لیے خرید نہ سکی۔ اس لڑکے نے کیا بھلا سا نام تھا؟ ہاں یاد آیا۔ نعیم۔ اس کا نام نعیم تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مونا کو انگوٹھی لا کر دے گا۔ خواہ کتنی ہی قیمت ہو۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا! اول تو تم ہمارے لیے بالکل ہی اجنبی ہو' اور اگر ہمارے اپنے بھی ہوتے تو بھی ہم ایسا قیمتی تحفہ کبھی قبول نہ کرتے۔"

اعظم کو یاد آیا کہ خاتون ایسی اصول پرست تھی کہ انہوں نے قیمت ادا کیے بغیر اعظم سے بھی چینی لینا گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ بولیں "نعیم اچھا اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اس نے کہا کہ ماں جی آپ کی بیٹی یک مشت قیمت ادا کر کے انگوٹھی نہیں پہن سکیں گی۔ میں مونا صاحبہ کو اس شرط پر انگوٹھی دوں گا کہ یہ قیمت قسطوں میں ادا کر دیں گی۔"

اعظم کو اطمینان ہوا کہ نعیم محبت سے نہیں سودے بازی سے ہی انگوٹھی پہنا سکتا ہے۔ خاتون نے کہا۔ "میں نے نعیم سے پوچھا۔ آخر وہ سونے کی انگوٹھی قسطوں میں کیوں دینا چاہتا ہے۔ خدا نہ کرے یہ چوری کا مال تو نہیں ہے؟ نعیم نے جواب دیا۔ ماں جی! اتفاق سے انگوٹھی کی رسید گم ہو گئی ہے مگر میں آپ کے محلے کے پانچ آدمیوں کے سامنے یہ رسید لکھ دوں گا کہ انگوٹھی چوری کی نہیں ہے اور میں اس کی قیمت قسطوں میں وصول کر رہا ہوں۔"

پھر وہ اعظم سے بولیں۔ "بیٹا! اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہمیں مشورہ دو کہ پکی رسید مل رہی ہو تو انگوٹھی لینا چاہیے یا نہیں؟"

وہ فوراً ہی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ سوچنے کے لیے اس نے منہ میں لقمہ رکھ لیا تاکہ بول نہ سکے۔ جواب طلب کرنے والے بھی ذرا صبر کر لیں۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ انگوٹھی چرائی گئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو چور نہیں کہہ سکتا تھا اور اس کے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ چوری کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتی ہے۔ فی الحال ایک ہی صورت تھی کہ وہ بھائی کا رشتہ ظاہر نہ کرے اور انگوٹھی کے سلسلے میں انجان بنا رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' جب وہ صاحب پکی رسید دے رہے ہیں تو قسطوں پر خرید لینا چاہیے۔"

اچھی طرح لقمہ چبانے کے باوجود اسے نگلنے میں تکلیف ہوئی۔ اس کا دل ایسا صاف آئینہ تھا کہ وہ جھوٹ اور فریب کو نگل نہیں سکتا تھا۔ اگر بحالت مجبوری نگل بھی جاتا تو اس کا ضمیر کچوکے لگانے لگتا۔ وہ بھائی کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا مگر مونا کے اعتماد کو

ٹھیس نہیں پہنچا سکتا تھا۔ کھانے کے بعد خاتون ذرا لیٹنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "مونا میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھہرو پہلے میں چائے لاتی ہوں' پھر باتیں کریں گے۔"

"تمہاری امی آ جائیں گی۔"

"نہیں آئیں گی۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے۔ وہ ہمیں باتیں کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دیں گی۔"

وہ برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔ اعظم کو تھوڑی دیر اور سوچنے کا موقع مل گیا۔ دل ڈر رہا تھا کہ سچائی مہنگی پڑے گی۔ سچ بولنے سے پہلے جھوٹ ہمیشہ آدمی کو ڈراتا ہے مگر مونا جب چائے لے کر آئی تو وہ شروع ہو گیا۔ "مونا! اس رات میں نے تم پر نادانستگی میں حملہ کیا تھا اگر یہ بات میں تمہیں نہ بتاتا تو تم انجان ہی رہتیں لیکن میں تم سے کوئی بات چھپا کر سکون سے نہیں رہ سکتا۔"

وہ بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھتی ہوں تم سچے اور کھرے انسان ہو مگر اب یہ ذکر کیوں چھیڑ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ ابھی کچھ اور سچ بولنے کے لیے رہ گیا ہے۔ میں نے اس روز بتایا تھا کہ جس نے سنار کا شوکیس توڑا تھا وہ چور ہونے کے باوجود چور نہیں ہے بہت ہی معصوم ہے۔"

"میں کیسے مان لوں کہ ایک آدمی چوری بھی کرے اور بے گناہ معصوم بھی سمجھا جائے؟"

"میری بات کا یقین کرو۔ وہ جنگی قیدی تھا۔ دشمنوں نے اس پر ایسے ظلم ڈھائے ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ تار کانٹے کی چار دیواری میں رکھا جاتا تھا اور تار کانٹوں کے باہر کھانا رکھا جاتا تھا۔ جب وہ بھوک سے مجبور ہو کر اپنے کھانے تک پہنچنا چاہتا تھا تو آہنی کانٹے اس کے جسم میں کتنے ہی خنجروں کی طرح چبھتے تھے اور لہو کی لکیریں بناتے تھے۔"

مونا نے ہمدردی سے کہا۔ "بے چارہ"

"تم خود سوچو اپنے وطن کے لیے لڑنے والا سپاہی چور بدمعاش کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔ نہیں ہو سکتا مگر اس نے شوکیس کیوں توڑا تھا؟"

"تمہیں انگوٹھی پہنانے کے لیے۔"

وہ ایک دم سے چونک کر حیرانی سے بولی۔ "میرے لیے؟ وہ کیا نعیم ہی وہ آدمی ہے؟"

"ہاں۔ تم تعلیم یافتہ ہو۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھ سکتی ہو۔ اس کے دماغ میں یہ کمزوری باقی رہ گئی ہے کہ وہ اپنے سامنے تار کانٹوں جیسی کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟"

"وہ میرا بھائی ہے۔ اپنا سگا۔ چھوٹا بھائی.........."

مونا نے پہلے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر حیرانی سے پوچھا۔ "تم نے یہ بات اب تک کیوں چھپائی تھی؟"

"بہت سی باتوں نے مجھے اُلجھا دیا تھا۔ پہلی بار میں نے سوچا کہ میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا اس لیے مجھے تمہارے سامنے اقبال جرم کرنا چاہیے۔ وہ میں نے کیا۔ میں نعیم کی بات کسی کے سامنے نہیں کرتا۔ تمہارے سامنے بھی اس کا نام نہیں لیا کیونکہ اس سے براہ راست تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کل اچانک مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اس نے برداشت نہیں کیا کہ تمہارے اور انگوٹھی کے درمیان شوکیس کی دیوار کھڑی ہو جائے۔"

وہ توجہ سے سن رہی تھی اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ اعظم کہہ رہا تھا۔ "مونا! میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو میں اسے رقیب کہتا۔ بھائی کو کیسے کہوں؟"

"کیا نعیم جانتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں نے اب تک اسے نہیں بتایا۔ بتاؤں گا تو یہ بات اس کے لیے چیلنج بن جائے گی۔ وہ اپنے اور تمہارے درمیان مجھے تار کانٹا سمجھے گا۔"

"یہ تو الٹی بات ہو گئی۔ تار کانٹا تو وہ خود بن رہا ہے اعظم! اب اسے بتا دینا چاہیے کہ وہ ہماری خوشیوں کا دشمن بن رہا ہے۔"

"مونا! اسے بتانے کا یہ انداز نہیں ہونا چاہیے۔ موقع دیکھ اسے محبت اور نرمی سے سمجھانا ہو گا۔"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے اعظم! کہیں وہ مجھ سے زیادتی پر نہ اتر آئے۔"

"نہیں مونا! وہ تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کیونکہ تم منزل ہو۔ میں پتھر ہوں۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہے گا۔"

وہ اعظم کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "میں صرف تمہاری منزل ہوں میں نعیم کو سمجھاؤں گی۔"

"ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ وہ تمہاری باتیں ذرا سہولت سے اور قدرے ٹھنڈے دماغ سے سنے گا۔ میں نے آج تک اسے کسی عورت سے اونچی آواز میں کبھی بات کرتے نہیں دیکھا۔"

"ظاہر ہے تمہارا بھائی ہے تمہارے جیسا ہو گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ دشمن حالات نے اس کے دماغ میں انتقامی جذبات بھڑکا دیے ہیں۔"

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کی پشت کی طرف سے ہاتھ پہنچا کر شانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری باتوں سے میرے دماغ کا بوجھ اتر گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جسے ظلم کی زبان نہ سمجھا سکی اسے عورت کی محبت بھری زبان سمجھا دے گی۔ کیا وہ انگوٹھی لے کر یہاں آئے گا؟"

وہ بولی۔ "اس نے گھر نہیں دیکھا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ کل صبح میں اسی بس اسٹاپ پر رہوں گی۔ وہ اپنی گاڑی میں آئے گا تو میں اسے یہاں امی کے پاس لے آؤں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اعظم کے شانے پر سر رکھ دیا۔ اعظم نے دونوں بازوؤں کے سائے میں اسے پیار سے سمیٹ لیا۔ پیار کی دولت ملے تو دونوں ہاتھوں سمیٹی جاتی ہے۔ وہ دونوں بہت دیر تک محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ آنے والے سہانے دنوں کے خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ مونا سے رخصت ہو کر باہر آیا۔ جی چاہتا تھا کہ کھلے آسمان تلے آزاد پرندے کی طرح اڑتا اور چہچہاتا رہے۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ اپنی عورت صرف اپنی پونجی ہے تو پھر وہی عورت نظر آتی رہتی ہے' کسی مخالف کی صورت نظر نہیں آتی۔

رات کو وہ دیر سے گیراج کے اوپر والی منزل پر پہنچا۔ نعیم اور سعید خان سو گئے تھے' گھر کا سارا سامان بندھا پڑا تھا۔ نئے مکان میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ سعید خان نئے کاٹج میں جانے کے لیے بے چین تھا۔ یقیناً دونوں بھائیوں پر جھنجلا کر سو گیا ہو گا۔ اعظم

اپنے بستر پر چپ چاپ سو گیا۔ مونا کو پالینے کی خوشی میں نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے کے اندھیرے میں صرف مونا ہی بار بار آرہی تھی۔ اس لڑکی میں سادگی بھی تھی اور شوخی بھی، اور حسن اداؤں کے ہجوم میں بھی وہ سیدھی سادی سی لگتی تھی۔ اسے دیکھو تو دکھائی دیتی تھی، سوچو تو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کسی سے پیار کرو تو پتہ چلتا ہے کہ ہم سوتے جاگتے اس کو کیوں دیکھتے ہیں؟ باتیں کسی سے کرتے ہیں۔ سوچتے اس کے لئے ہیں۔ دیکھتے ہیں سامنے والے کو اور نظر آتی ہے پیچھے والی۔ یہ دلچسپ اور دلنشین تماشے صرف محبت کرنے والی آنکھیں ہی دیکھتی ہیں۔

سوتے جاگتے صبح ہو گئی۔ وہ حسب عادت مارننگ واک کے لیے گھر سے نکل گیا۔ اجالا پھیلنے تک وہ اسی اخبار فروش تک پہنچ کر روز ایک اخبار خریدتا تھا۔ پھر چائے خانے میں بیٹھ کر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس اخبار کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اب کچھ دنوں میں مونا دلہن بن کر آنے والی تھی۔ پھر وہ بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھتا اور مونا صبح کی چائے لایا کرتی۔ ایسی چائے میں ایک بیوی کی محبت اور مٹھاس شامل ہوتی ہے۔

اس نے بھاجی پوری کھانے کے بعد گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ ساڑھے نو بجے بفرزون کے بس اسٹاپ پر مونا اور نعیم ملنے والے تھے۔ اس حساب سے نعیم نو بجے گیراج سے گاڑی لے کر جانے والا تھا۔ اعظم اپنے بھائی سے اس وقت تک نہیں ملنا چاہتا تھا، جب تک کہ مونا اسے پیار و محبت سے اچھی طرح سمجھا نہ دیتی۔ نعیم کو سمجھانے کے لیے اب محض محبت ہی کی زبان رہ گئی تھی۔

چائے پینے کے بعد وہ پونے نو بجے ہوٹل سے اٹھ کر گیراج کی طرف گیا۔ گیراج کھل گیا تھا۔ ملازم چھوکرے کام میں مصروف تھے۔ سعید خان بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اعظم کو دیکھتے ہی لپک کر قریب آیا پھر بولا۔ "ارے تم کہاں رہ گئے تھے؟ وہ بہت غصے میں یہاں سے گیا ہے۔"

"کون؟" اعظم نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا نعیم کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے اس سے کہا کہ کہیں نہ جاؤ۔ آج ہم نئے کاٹج میں سامان لے جائیں گے۔ مگر وہ اسی لڑکی کے پیچھے جانے پر بضد تھا۔ تب مجھے کہنا پڑا کہ وہ سائے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ مونا اعظم کو چاہتی ہے۔"

"اوہ سعید! تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"بھئی ایک دن تو اسے بتانا ہی تھا۔"

اعظم گیراج کے سامنے کھڑی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے مونا سے بات کی تھی۔ وہ خود ہی نعیم کو سمجھانے والی تھی۔"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں دوست ہوں، تم بھائی ہو وہ ہماری بات نہیں سمجھے گا اور اس لڑکی کی بات سمجھ لے گا۔ یہ کوئی ماننے والی بات ہے؟ ارے اسے سمجھنا ہوتا تو وہ غصے میں کیوں آتا۔ ایک دم سے لال پیلا ہو کر گیا ہے یقیناً اس پر دورہ پڑ رہا ہے۔"

اعظم نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ مونا اب خطرے میں تھی اور ایک عورت کی خاطر دو بھائیوں کے درمیان فساد کی آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

نعیم اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھا کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ونڈاسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ ونڈاسکرین کے پار ایک دنیا دکھائی دیتی ہے مگر اسے مونا ہی مونا نظر آرہی تھی۔ دماغ میں سعید کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نعیم! دنیا کی ہر چیز صرف تمہارے لیے نہیں ہو سکتی......... تار کانٹوں کے پیچھے دنیاوی رکاوٹوں کے پیچھے کوئی چیز ہمارے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارے بھائی کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور مونا تمہارے بھائی کے لیے ہے۔ وہ اعظم سے محبت کرتی ہے۔"

نعیم نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ ذہن بھی ویسی ہی رفتار سے چیخ رہا تھا۔ "جو میں چاہتا ہوں، وہ دوسرے کیوں چاہتے ہیں؟ اعظم کسی دوسری لڑکی سے بھی شادی کر سکتا ہے۔"

ونڈاسکرین کے شیشے پر مونا مسکراتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک حسین عورت کے تصور کی یا تصویر کی مسکراہٹ سب ہی کو بہلاتی ہے خواہ وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ اور جو پرائے ہوں، اس مسکراہٹ کو اپنے لیے سمجھ کر دھوکا کھا جائیں تو مسکرانے والی بھلا کیا کرے؟

وہ مسکرا کر اسیر کرنے والی بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی۔ نعیم کی کار سامنے آکر رکی تو وہ اخلاقاً مسکرانے لگی۔ نعیم نے اپنی سیٹ پر جھک کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے گھبراہٹ کا اظہار کیا۔ "مونا! اعظم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کیا تم اسے دیکھنے چلو گی؟"

مونا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فوراً ہی نعیم کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”اللہ حافظ ہے۔ اعظم کہاں ہے؟ کیا زیادہ چوٹیں آئی ہیں؟“

دوسری طرف اسی سڑک کے ایک موڑ پر سے اعظم نے مونا کو دیکھا۔ اس وقت مونا نعیم کی کار میں بیٹھ رہی تھی۔ وہ اپنی کار کو فوراً ہی آگے نہ بڑھا سکا۔ مونا تک پہنچنے کے راستے میں بہت سی کاریں بھیڑ کی وجہ سے آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ سڑک پر گاڑیوں کی ایسی بے ترتیبی تھی کہ وہ اوورٹیک کر کے نعیم کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ بہرحال اس نے سوچا۔ ”میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا ہوں۔ مونا اسے اپنے گھر لے جائے گی۔ پیچھے پیچھے میں پہنچ جاؤں گا۔“

نعیم نے مونا کو جواب دیا۔ ”ہم نے ایک نیا کاٹیج خریدا ہے.......... اعظم کو اسی کاٹیج میں چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”ایکسیڈنٹ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟“

نعیم کہنا چاہتا تھا کہ اعظم حادثے کے وقت شراب کے نشے میں تھا۔ مونا اسے شرابی سمجھ کر شاید نفرت کرنے لگے لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکا۔ جھوٹ کہنا' کسی کی برائی کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ تار کانٹے کو پار کرتے وقت اس پر ایک ہی دھن سوار رہتی تھی کہ وہ اپنی ضرورت تک پہنچ جائے۔ اس نے بھائی کی برائی نہیں کی مگر جھوٹ کہا۔ ”کل رات کو اس کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ لوگ اسے اسپتال لے گئے تھے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں وہاں گیا۔ اس کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ وہ اسپتال میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں اسے کاٹیج میں لے آیا۔“

اعظم نے دور سے دیکھا' نعیم کی کار مونا کے گھر کی سمت جانے کے بجائے سیدھی جا رہی تھی اور بھیڑ کے باوجود اس کی کار کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ اعظم نے بھی اوورٹیکنگ شروع کر دی۔ اپنے آگے والی گاڑیوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ نعیم مونا کے گھر نہیں جا رہا ہے بلکہ اسے اغوا کر کے کہیں لے جا رہا ہے۔

دوسری سڑک پر ٹریفک کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ نعیم اس سڑک پر پہنچتے ہی کار کی رفتار بڑھانے لگا۔ مونا بے چین تھی۔ رہ رہ کر اعظم اس کے تصور میں زخموں سے چُور نظر آتا تھا۔ وہ بڑے اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ”کیا بہت زیادہ چوٹیں آئی

ہیں؟“

”ہاں۔ سر اور چہرہ پٹیوں میں چھپ گیا ہے۔ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔“

مونا نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دل میں درد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتی۔ اس کے زخمی چہرے کو اپنے سینے سے لگا لیتی۔ نعیم کن انکھیوں سے اس کی حالت زار کو دیکھ رہا تھا۔ جب سعید خان نے اسے بتایا تھا کہ مونا اعظم سے محبت کرتی ہے تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔ پھر بھی اسے غصہ آیا تھا۔ اس محبت والی بات کی تصدیق کے لیے اس نے مونا کے پاس پہنچتے ہی حادثے کی جھوٹی خبر سنائی۔ اس طرح اس نے معلوم کر لیا کہ مونا واقعی اعظم کو چاہتی ہے۔ صرف چاہتی ہی نہیں' زخمی اعظم کے لیے تڑپتی بھی ہے۔

وہ اس کی بے چینی اور تڑپ کو سمجھ رہا تھا اور بڑی سفاکی سے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ جسے وہ چاہتا تھا وہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنے ساتھ اسے لے جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ مونا کو حادثے اور موت کی پروا نہیں تھی۔ اعظم تک پہنچنے کے لئے وہ تیز رفتاری بھی سست لگ رہی تھی۔

اعظم نے بھی اپنی گاڑی کی رفتار تیز رکھی تھی وہ مونا اور نعیم تک پہنچنے ہی والا تھا کہ اچانک ہی تقدیر نے سرخ بتی دکھا دی۔ اس نے ٹریفک کے اصول کے مطابق گاڑی روکنے کے لیے رفتار سست کی مگر نعیم سرخ سگنل کے باوجود اسی رفتار سے چوراہے کو عبور کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اعظم کو غلطی کا احساس ہوا۔ اب وہ فوراً ہی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کیونکہ دوسری طرف سے گزرنے والی گاڑیاں راستہ روک چکی تھیں۔

ایک منٹ بعد اسے آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ اس ایک منٹ میں نعیم کی کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اعظم نے گاڑی بڑھاتے ہوئے سوچا۔ وہ کہاں جائے گا؟ مونا کو کسی ویران علاقے میں لے جائے گا۔ یقیناً وہ راستہ شہر کے باہر جاتا تھا۔ اسے یہ حیرانی تھی کہ مونا نعیم کے ساتھ خاموشی سے شہر کے باہر کیوں جا رہی ہے۔ وہ چلا چلا کر آس پاس سے گزرنے والوں کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ مگر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ راضی خوشی نعیم کے ساتھ جا رہی ہے۔ یہ دل توڑنے والی بات تھی لیکن اعظم نے خود کو تسلی دی کہ وہ بے ہوش کر دی گئی ہے۔ اس لیے ٹریفک کے سپاہیوں کو بھی مدد کے لیے نہیں پکار رہی ہے۔

وہ اندازاً اس سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ جن کا تعاقب کر رہا تھا وہ دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ شہر سے باہر اسی راستہ پر وہ نیا کاٹج ہے جسے حال ہی میں انہوں نے خریدا ہے اور سعید خان کے بار بار کہنے کے باوجود ابھی تک وہاں سامان منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ اعظم کو یقین ہو گیا کہ نعیم مونا کو اسی کاٹج میں لے جا رہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔

شہر سے دور وہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ مگر ابھی غیر آباد تھا۔ نئے مکانات کی تعمیر کے لیے پلاننگ ہو رہی تھی۔ فی الحال وہی ایک کاٹج وہاں نظر آ رہا تھا۔ نعیم نے کاٹج کے احاطہ میں پہنچ کر گاڑی روک دی۔ مونا نے حیرانی سے پوچھا۔ "اعظم کو اس ویرانے میں کیوں لائے ہو؟ کیا ڈاکٹر مرہم پٹی کے لیے اتنی دور آئے گا؟"

وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ نعیم کار کے دوسری طرف سے آتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر سے ہماری واقفیت ہے ہم سوچ سمجھ کر ہی یہاں آئے ہیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر کاٹج کے دروازے کا تالا کھولا۔ مونا اس کے ساتھ اندر آئی۔ پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہاں تو کوئی سامان نہیں ہے۔"

پہلی بار اسے نعیم پر شبہ ہوا مگر اسے سمجھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ سامان بھی نہیں ہے اور اعظم بھی نہیں ہے۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔"

وہ ایک دم سہم گئی۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "تم تو بہت اچھے ہو۔ جھوٹ بول کر مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"میں اچھا نہیں ہوں۔ ذلیل آدمی ہوں۔ لوگ مجھ سے میری ضرورت اور میری پسند کی چیزیں چھین لیتے ہیں۔"

اس بات کو اس نے بڑے کرب سے کہا۔ مونا نے متاثر ہو کر سوچا۔ "واقعی یہ مظلوم ہے۔ اس کے سامنے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ محبت اور نرمی سے سمجھانا چاہیے۔"

یہ سوچ کر اس نے پوچھا۔ "نعیم! دنیا والے تم سے تمہاری پسند کو چھینتے ہیں تو تمہیں دکھ پہنچتا ہو گا؟"

"ہاں میں انسان ہوں۔ مجھے دکھ پہنچتا ہے۔"

"تو پھر ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ تم کبھی غصے یا انجانے پن میں دوسروں کی پسند کو چھین لیتے ہو تو دوسروں کو بھی ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہو گی۔"

وہ یک بیک قہقہہ لگا کر بولا۔ "آدمی اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔"

"نعیم! یہ فطرت نہیں، انسان کی اپنی بنائی ہوئی عادت ہے۔ آؤ آج ہم اس عادت پر تھوک دیں۔ کسی چیز کو حاصل کرنے سے پہلے انصاف سے فیصلہ کریں کہ اس چیز کا پہلا حقدار کون ہے۔"

وہ مونا کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "تمہارا پہلا حقدار میں ہوں۔ اعظم سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا۔ تمہیں چاہا۔ تمہاری یہ خالی انگلی میرے سینے میں چبھتی رہی۔ میں نے اسے انگوٹھی پہنانے کے لیے چوری کی۔ تمہیں اس شہر کی ہر گلی کوچے میں تلاش کرتا رہا۔ جب مجھے اپنی منزل ملی تو اعظم میرے سامنے دیوار بن گیا۔ اگر تم انصاف کرنا جانتی ہو، تو بتاؤ فیصلہ اس کے حق میں کیسے ہو گا؟ مجھ سے ناانصافی کیسے کرو گی؟"

"میں انصاف کروں گی بشرطیکہ تم انصاف کو سمجھنا چاہو۔ دیکھو نعیم! میں کوئی گونگی بہری جائیداد نہیں ہوں کہ جس نے طلب کیا، اس کے حصے میں چلی جاؤں۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں۔ اسلامی دستور کے مطابق پہلے لڑکی سے نکاح قبول کرایا جاتا ہے یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس میں پہلے مرد کی نہیں، عورت کی مرضی معلوم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد مرد نکاح قبول کرتا ہے۔"

نعیم نے پہلے لاجواب سا ہو کر اسے دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں پوچھا۔ "تو تم اعظم کو قبول کرتی ہو؟"

مونا نے وضاحت سے جواب دیا۔ "اعظم کو قبول کر لینے کا مطلب ہے کہ میں تمہیں بھی چاہتی ہوں۔ تم محبت کے قابل ہو۔ محبت کی اخلاقی حدود میں رہ کر میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"یہ سب بکواس ہے مجھے بہلانے والی باتیں ہیں تم صرف میری ہو، میری رہو گی۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ مونا پیچھے ہٹنے لگی۔ نعیم کو پیار سے سمجھانے کا جذبہ کمزور پڑ گیا تھا۔ اب وہ خوفزدہ ہو کر اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ اسی وقت باہر ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ نعیم نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کوئی کار کاٹج کے قریب ہی

آ کر رکی تھی۔ نعیم تیزی سے چلتا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھنے گیا۔ بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ مونا دوڑتی ہوئی دروازے کو کھول کر باہر نکل گئی۔

اعظم اپنی کار سے باہر نکل رہا تھا۔ مونا چیختی ہوئی‘ اسے آوازیں دیتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ اعظم نے اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ سہارا ملنا اور بات ہے۔ اس سہارے کا قائم رہنا اور بات ہے۔ کاٹیج کے دروازے پر نعیم ہاتھ میں ایک کلہاڑی لیے سہارے کو توڑنے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔

اعظم نے مونا کو ایک طرف ہٹا دیا۔ پھر نعیم کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں بھائی خاموش تھے اور ایک دوسرے کو گہری سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔ نعیم کے دماغ کے اسکرین پر ماضی کی فلم چل رہی تھی۔ فلم کے منظر میں اخبار کا گولا بنا کر اچھال رہا تھا اور اسے کیچ کر رہا تھا۔ اعظم نے اس کاغذ کے گولے کو اس سے چھین لیا۔ اس کے اور کاغذ کے گولے کے درمیان دیوار بن گیا۔ پھر دونوں میں ہاتھاپائی شروع ہو گئی۔ لات‘ گھونسے‘ زخم‘ آہیں اور کراہیں‘ یہ سب ایک عرصے سے چل رہے تھے۔ یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

نعیم نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مونا نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ یہ تمہیں چاہتی ہے۔ اگر تم اپنی خودغرضی کے کانٹے نہ بچھاتے تو مونا صرف مجھے چاہتی۔ یہ اعتراف کر چکی ہے کہ میں محبت کے قابل ہوں۔“

مونا جلدی سے بولی۔ ”بیشک تم بہت اچھے ہو۔ محبت کے قابل ہو۔ میں ہونے والی بھابی کے ناطے تمہیں ماں کا پیار دیتی رہوں گی۔“

”بکواس مت کرو۔“ اس نے چیختے ہوئے کلہاڑی اٹھائی۔ پھر اعظم پر حملہ کر دیا۔ وہ چوکنا تھا۔ فوراً جھک گیا۔ کلہاڑی سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی کار کی کھڑکی تک پہنچی۔ ایک چھناکے سے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ مونا کی چیخ سنائی دی۔ مگر اعظم صحیح سلامت تھا۔ وہ کلہاڑی کو گرفت میں لے کر چھین رہا تھا۔ نعیم بھی اس پر قابض رہنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دھکے کھا کر آگے پیچھے جا رہے تھے۔ اعظم نے کہا۔ ”نعیم! ہوش میں آؤ۔ میں ہر مقام پر جان بوجھ کر تم سے شکست کھا سکتا ہوں مگر مونا کے لیے تمہیں ہوش و حواس میں رہ کر سمجھنا ہو گا کہ مقدس رشتوں کے درمیان تار کانٹے نہیں ہوتے۔“

”ہوتے ہیں اور وہ تم ہو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“

وہ غصے اور جنون کی حالت میں زور لگا کر کلہاڑی چھین لینا چاہتا تھا۔ اعظم نے اسے زور لگانے کا موقع دیا۔ اس کے دھکے کھا کر پیچھے جاتا رہا۔ پھر یک بیک زمین پر گر کر اسے پاؤں پر رکھتے ہوئے دوسری طرف اچھال دیا۔ دھپ کی آواز کے ساتھ وہ دور جا گرا۔ کلہاڑی اعظم کے ہاتھ میں رہ گئی۔

دونوں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ نعیم مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ”تم یہ نہ سمجھنا کہ کلہاڑی میرا راستہ روک دے گی۔“

”تم رکاوٹ سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے راستے کا پتھر نہیں ہوں۔ یہ لو..........“

اعظم نے کلہاڑی کو اس کی طرف اچھال دیا۔ نعیم نے اسے کیچ کیا۔ مگر کسی کشمکش میں کھڑا رہ گیا۔ اعظم نے کہا۔ ”تار کانٹوں کو کاٹ کر آگے بڑھنا دلیری ہے مگر بھائی کی لاش پر سے گزرنا سراسر خودغرضی ہے۔“

وہ ہولے ہولے کسمسانے لگا۔ کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ فیصلے کی کسی نازک گھڑی میں حملہ کرے گا۔ مونا ان کے درمیان آگئی پھر اپنا ایک ہاتھ نعیم کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”جس انگلی میں تم انگوٹھی پہنانا چاہتے ہو پہلے اس ہاتھ کو کاٹ ڈالو۔ ورنہ اعظم کو کچھ ہو گیا تو تم میری لاش ہی کو انگوٹھی پہنا سکو گے۔“

نعیم کی نگاہوں کے سامنے مونا کا ہاتھ کائنات کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ راستہ روکنے والے ہاتھوں کو کاٹ سکتا تھا۔ مگر اپنے ہاتھوں سے اپنی کائنات کو نہیں مٹا سکتا تھا۔ وہ دانت پیس کر‘ ہونٹوں کو بھینچ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ دوسری طرف مونا کا پھیلا ہوا ہاتھ دور ہی دور سے اس کے جنون کو تھپک رہا تھا۔

پھر اس نے کلہاڑی پھینک دی۔ دو قدم آگے بڑھ کر مونا کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ کو تھام کر محبت اور حسرت سے دیکھنے لگا۔ اب مونا اندر سے سہمی ہوئی کانپ رہی تھی‘ نہ جانے اگلے چند لمحوں میں وہ کیا کرنے والا تھا۔ اعظم بڑے اعتماد سے دور کھڑا رہا۔ اتنے میں اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکالی۔ پھر اسے مونا کی انگلی میں پہنا دیا۔ وہ اطمینان کی سانس لے کر بولی۔ ”شکریہ نعیم! تم بہت عظیم ہو۔“

وہ تیزی سے پلٹ کر اپنی کار کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا۔

اعظم نے آواز دی۔ ”نعیم! رک جاؤ......... تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مونا تمہارے ساتھ.........“

بات پوری ہونے سے پہلے ہی کار اسٹارٹ ہو کر تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ کالج کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ مونا نے قریب آ کر کہا۔ ”اعظم! اسے فی الحال تنہا رہنے دو۔ اسے سکون سے حالات کا مقابلہ کرنے دو۔“

اعظم اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”نہیں مونا! وہ جس انداز میں گیا ہے‘ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کے دماغ میں غبار بھرا ہوا ہے۔“

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ جب اس کی ضد پوری نہیں ہوتی۔ جب وہ اپنی ضرورت تک پہنچ نہیں سکتا......... تو کوئی دوسرا ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے۔“

وہ کار کی رفتار بڑھانے لگا۔ مونا ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”آدمی پاگل نہیں ہوتا۔ دنیا والے اسے پاگل بنا دیتے ہیں۔“

کار کی محدود فضا میں خاموشی چھا گئی۔ مونا ہمدردی سے سوچ رہی تھی۔ اعظم سوچ رہا تھا کہ نعیم کے اندر جو غبار رہ گیا ہے اسے کیسے نکالے۔ فی الحال اسے تنہا کہیں جانے سے روکنا تھا اور وہ پتہ نہیں کتنی دور نکل گیا تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار حدِ نظر تک اس کی کار نظر نہیں آ رہی تھی۔

اگلے ایک موڑ پر اچانک ہی اعظم کے ذہن کو جھٹکا سا لگا......... گاڑی چیختی کراہتی ہوئی رک گئی۔ سڑک کے کنارے ایک بڑے درخت سے نعیم کی کار ٹکرا گئی تھی۔ وہاں سے گزرنے والے بھیڑ لگا رہے تھے۔ اعظم اور مونا اپنی کار سے نکل کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ اعظم یقین سے کہہ سکتا تھا کہ نعیم جان بوجھ کر حادثے کا شکار ہوا ہے۔

کار کا اگلا حصہ پچک گیا تھا۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ وہ دونوں قریب پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ لہو میں ڈوبا ہوا چہرہ اسٹیئرنگ پر ٹکا ہوا تھا۔ دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ زندگی میں خواہشات کے جتنے تار کانٹے ہوتے ہیں‘ وہ ان سب کو توڑ کر جا چکا تھا......... مونا اعظم کے بازو میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

پاک منزل

بھان متی نے کنبہ جوڑا، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔

ایک غنڈے بدمعاش کا فکر انگیز قصہ۔

اس نے معاشرے میں عزت سے جینے کا عزم کر رکھا تھا۔

ایک آئینہ جس میں ہم سب کو اپنی صورتیں نظر آئیں گی۔

وہ ایک سال کے بعد جیل سے باہر آنے والی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی تازہ اور چمکیلی تھی۔ لوگ انسانوں کو قید کر دیتے ہیں لیکن کوئی آج تک روشنی کو قید نہ کر سکا۔ وہ آہنی سلاخوں سے گزرتی ہوئی جیلر کی میز تک پہنچ رہی تھی اور رجسٹر پر لکھے ہوئے ناموں کو اجاگر کر رہی تھی۔

"قیدی نمبر ستائیس .... نام نادر بیگ۔"

جیلر نے اسے پڑھنے کے بعد سر کے سفید بالوں کو کھجایا۔ اس کے سر کے سارے بال جیل کی دھوپ میں سفید ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے آنکھیں اٹھا کر سامنے کھڑے ہوئے قیدی نمبر ستائیس کو دیکھا جس کا نام نادر بیگ تھا۔ چھ فٹ کے قد آور نوجوان کو سر اٹھا کر دیکھتے وقت جیلر کی ٹوپی سر سے ڈھلک جاتی تھی۔ اسی لئے اس نے پہلے ہی سے ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی تھی۔ پھر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

"نادر بیگ! جیل کے اندر تمہارا ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ اسی طرح تمہیں جیل کے باہر بھی اچھا ریکارڈ بنانا چاہئے۔"

"جناب! جیل کے اندر جتنی آسانی سے روٹیاں مل جاتی ہیں اگر آپ یہی انتظام باہر بھی کر دیں تو انشاء اللہ ریکارڈ اچھا رہے گا۔"

جیلر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ سر اٹھا کر دیکھتے وقت گردن دُکھنے لگتی تھی۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری سزا پوری ہو چکی ہے۔ میں تمہیں اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتا ہوں۔ دیکھو! ہر انسان روٹی کی شکایت کرتا ہے کہ اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ اس دنیا میں رہنے کے لئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے لیکن عزت

ں سے بھی زیادہ مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔"

"بیشک۔" نادر بیگ نے سر ہلا کر کہا۔ "پیٹ میں روٹی ہو تو عزت کا خیال آتا ہے' ہو تو صرف بھوک لگتی ہے۔ ویسے اب میں اپنے بازوؤں کی محنت سے روٹی حاصل روں گا۔ مگر آپ یقین کریں کہ جو عزت ہڈحراموں کو ملتی ہے' وہ محنت کرنے والوں کو ہیں ملتی۔"

"پھر بھی تمہاری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ تم دوبارہ یہاں نہ آؤ۔ شرافت کی زندگی گزارو گے تو پھر کسی شریف آدمی کی طرح یہاں نہیں آؤ گے۔"

"لیکن جناب! آپ تو ساری زندگی یہاں رہیں گے۔"

جیلر بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا۔ نادر بیگ نے جلدی سے کہا۔

"دیکھیں آپ برا نہ مانیں۔ یہاں میں نے ایسے قیدیوں کو بھی دیکھا ہے جو چور نہیں تھے مگر چوری کے الزام میں پکڑے گئے جو قاتل نہیں تھے مگر کسی کی عزت بچانے کی خاطر قاتل بن گئے۔ مگر ان کی شرافت تو بدستور اپنی جگہ قائم رہی۔ جیلر صاحب! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' یہاں آپ جیسے شریف آدمی بھی آتے ہیں۔ کیونکہ جیل کے باہر شرافت کا کوئی معیار نہیں ہے۔ قانون کی کسوٹی اچھے اور برے کو سمجھنے میں اکثر ناکام رہتی ہے۔"

جیلر نے زِچ ہو کر کہا۔

"تمہارے جیسے تعلیم یافتہ لوگوں سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ مگر دیکھو! تم ایک انسان ہو' تمہارے دل میں بہت سے ارمان ہوں گے تمہاری آنکھوں میں بہت سے خواب سجے ہوں گے۔ کیا تم کبھی ایک اچھی صاف ستھری زندگی کی آرزو نہیں کرتے ہو؟"

"کرتا ہوں۔ مگر تنہا ایک اچھی زندگی کیسے گزار سکتا ہوں؟ کوئی تو چاہنے والا ہو' کوئی میرے جنون کا خیر مقدم کرے' کوئی تو مجھے اپنی ضرورت سمجھے اور میری عزت کرے۔"

"اگر عزت نہ ہو تو اپنے اچھے اعمال سے عزت کرائی جاتی ہے۔ تم تنہا رہو گے تو سب تمہیں آوارہ' بدمعاش اور چھوٹا ہوا سانڈ کہیں گے۔ میرا مشورہ مانو کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو۔ جب اتنی بڑی دنیا میں عزت نہیں ملتی ہے تو انسان ایک چھوٹا سا خاندان بنا کر پہلے محدود پیمانے پر اپنی بیوی اور بچوں سے عزت حاصل کرتا ہے۔ پھر اس خاندان کے افراد بڑھتے ہیں۔ خاندان پھیلتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دور دور تک

عزت بھی پھیلتی جاتی ہے۔ ایک دن لوگ کہیں گے کہ اتنے بڑے خاندان کا بانی ایک محنت کرنے والا نادر بیگ تھا۔"

"ہم میں سے بہت سے لوگ شیخ چلی کی طرح اپنے سر پر انڈوں کی ٹوکری رکھ کر سوچتے ہیں کہ کس طرح ہم ایک گھر اور ایک بڑا سا خاندان بنائیں گے۔ مگر وہ سارے انڈے زندگی کی ایک ہی ٹھوکر سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اگر میں نے بھی یہی کیا تو آپ بتائیں کہ مجھ جیسے سزا یافتہ شخص کو کون اپنی بیٹی دے گا؟"

جیلر نے کہا۔ "تم کوشش کرو کسی لڑکی کو پسند کرو' اس کے ہاں رشتہ مانگنے جاؤ' ہم اس بات کی ضمانت دیں گے کہ تم شریف آدمی بن چکے ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس جیل سے باہر جانے والا ہر قیدی شرافت سے زندگی گزارے۔ ہم اس سلسلے میں تم جیسوں سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ تم بھی ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

"آپ حوصلہ دے رہے ہیں تو میں ضرور تعاون کروں گا۔ میں آپ سے وعدہ کر کے یہاں سے جا رہا ہوں کہ اپنی برداشت کی آخری حد تک حالات کا مقابلہ کروں گا۔ کسی محبوبہ کی مسکراہٹ سے یا کسی ماں کی گود سے پیار ملا تو میں اس پیار کے سہارے عزت سے رہنے کا سلیقہ سیکھتا جاؤں گا۔"

جیلر نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شاباش مجھے تم سے یہی امید ہے۔ ایک شریفانہ زندگی گزارنے کے سلسلے میں اگر کوئی مشکل آن پڑے تو تم اپنے علاقے کے تھانیدار سے جا کر ملنا۔ آج ہی تمہارے نام ایک سفارشی خط لکھ کر وہاں بھیج دوں گا۔ یہ لو پچاس روپے عزت کی زندگی شروع کرنے تک یہ تمہارے کام آئیں گے۔"

نادر بیگ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "جیلر صاحب! میں نے روٹی کا دکھڑا ضرور رویا ہے۔ کیونکہ میں آس پاس روتی ہوئی صورتوں کو دیکھتا رہتا ہوں لیکن میں مجبور نہیں ہوں۔ میں نے اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی لانڈری کھول رکھی ہے۔ میرا ملازم اکثر یہاں مجھ سے ملنے آتا تھا اور مجھے بتاتا تھا کہ لانڈری کا کام ٹھیک چل رہا ہے۔ آپ یہ روپے کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دیجئے۔"

جیلر نے خوش ہو کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں تم اندر سے ایک نیک انسان ہو۔ میں تمہیں نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کرتا ہوں........ خدا

حافظ۔"

آہنی سلاخوں والا دروازہ کھل گیا۔ وہ دروازے سے باہر آیا تو پھر جیل کے بڑے پھاٹک کا چھوٹا سا دروازہ بھی کھول دیا گیا۔ اس نے جیل کے دروازے سے باہر آ کر کھلی ہوا میں سانس لی۔ "اے آزاد ہوا........ اب میں بھی تیری طرح آزاد ہوں گا۔ جانوروں کی طرح جیل کے کٹہرے میں بند ہونے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ میں انسان ہوں دوسرے انسانوں کی طرح آزادی سے رہنے کا حق حاصل کروں گا۔"

اس کی لانڈری کا ملازم اس کے استقبال کے لئے آیا تھا۔ اپنے مالک کو دیکھتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ نادر نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ کیونکہ اتنی بڑی دنیا میں اس کو گلے لگانے والا کوئی اور نہیں تھا۔ جیل سے باہر آ کر دل مچل گیا تھا کہ کوئی تو ایسا ہو جو سینے سے لگا کر تنہائی کے احساس کو مٹایا جائے۔ ملازم نے کہا۔

"نادر بھیا! میں آپ کے لئے رکشہ لے کر آیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چل کر اپنی دکان دیکھ لیں اور پورے ایک سال کا حساب کر لیں۔"

نادر نے اس کی پیٹھ پر خوشی سے ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "اپنا حساب اپنے ہی پاس رکھو۔ مگر کچھ رقم لائے ہو تو وہ مجھے دے دو۔ آج میں تمام رات اور دن شہر میں آزادی سے گھومتا رہوں گا۔"

ملازم نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے اور اسے بتایا کہ باقی آمدنی کے چھ ہزار روپے بینک میں جمع ہیں۔ وہ دونوں رکشے میں بیٹھ کر پہلے ناظم آباد پہنچے۔ نادر ایک برس کے بعد پہلے اپنے محلے کو ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں اس کا تین کمروں کا ایک مکان تھا۔ سامنے والے کمرے کو اس نے لانڈری بنا دیا تھا' جو ایک معقول آمدنی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اپنے محلے میں پہنچ کر اس نے دو چار پڑوسیوں کو آوازیں دیں۔ مگر کوئی باہر نہیں آیا۔ کسی پڑوسی کے گھر والی نے کہا کہ اس کا گھر والا سو رہا ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں ہیں۔

نادر نادان نہیں تھا' سب سمجھ رہا تھا کہ شریف محلے والے اس سے ملنے سے کترا رہے ہیں۔ ایسے محلے اور ایسی دنیا میں رہ کر وہ کس کی محبت کا سہارا مانگے گا؟ کیسے اپنے لئے دوبارہ عزت بنائے گا؟ اس نے دل برداشتہ ہو کر ملازم سے کہا۔

"تم دکان کھول کر بیٹھو۔ میں رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔ رفتہ رفتہ ان محلے

والوں کو یقین دلاؤں گا کہ نادر بدمعاش مرچکا ہے۔ اسے تھوڑی سی عزت دو تو وہ بھ تمہاری سطح پر آکر شریفانہ زندگی گزارے گا۔"

یہ کہہ کر وہ محلے سے نکل گیا۔ پھر ناظم آباد کی گلیوں سے پیدل گزرتا رہا۔ وہاں ک مکانوں اور دکانوں کو اور آس پاس سے گزرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو بڑی محب سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ بچپن سے ناظم آباد کی دنیا اس کی اپنی دنیا تھی۔ وہاں کے رہنے وا سب اس کے اپنے ہی لوگ تھے۔ چونکہ اپنے رشتے دار نہیں تھے اور صرف ناظم آباد زمین کے رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ رشتے اسے نہیں پہچان رہے تھے صرف وہی محبت کی آنکھوں سے ہر ایک کو سمجھ رہا تھا۔

اس کی نظروں سے کتنی ہی خوبصورت لڑکیاں گزریں۔ جیلر کی باتیں یاد آئیں ک اسے کسی کو پسند کرنا چاہیے۔ پھر اسے اپنی دلہن بنا کر ایک نئے خاندان کی ابتدا ک چاہئے۔ دنیا کے اسی دستور پر چل کر اسے عزت ملے گی۔ مگر وہ حسینہ کون ہے جو اس ک نصیب میں لکھی گئی ہے۔ اس نے کتنی ہی لڑکیوں کو بڑی چاہت سے دیکھا۔ اکثر لڑکیو نے تو اس کی طرف دیکھا نہیں۔ کچھ لڑکیاں اس پر ایک سرسری نظر ڈالتی ہوئی گزر گئیں جیسے وہ کوئی فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا بھکاری ہو۔ کیا محبت کی بھیک مانگنے والے بھی بھکار کہلاتے ہیں؟ ایک لڑکی اس کے قریب سے اپنی ایک سہیلی سے باتیں کرتی ہوئی گزر گئی۔

"کیسا وحشی لگ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے برسوں سے آئینے میں اپنی شکل نہیں دیکھی ہے۔"

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ لباس پر نظر ڈالی تو ایک برس پرانا ہو چکا تھا۔ کیونکہ جیل میں جاتے وقت اس کا لباس اتروانے کے بع قیدیوں کا لباس پہننے کو دیا گیا تھا۔ اس کا وہ لباس محفوظ تھا۔ آج ایک برس کے بعد ا رہائی کے وقت پھر پہننے کے لئے مل گیا تھا۔ اس نے ایک دکان کے قریب جا کر آئینے م اپنا حلیہ دیکھا تو اسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ وہ آزادی کی خوشی میں بھول گیا تھا ک آدمی نظر آرہا ہے یا بندر؟ بندر سے آج تک کسی لڑکی نے محبت نہیں کی۔

وہ فوراً ہی واپس بھاگتا ہوا اپنی لانڈری میں پہنچا۔ وہاں سے ایک بہترین سوٹ نکا کر اپنے کمرے میں آیا۔ پہلے شیو کیا' پھر غسل کیا۔ اس کے بعد سوٹ پہن کر بندر س آدمی بن گیا۔ اسی وقت پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آنگن میں آکر دروا

کھولا تو وہاں ایک سانولی سی جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں میلے کپڑے تھے۔ نادر نے دل میں کہا۔

"بس یہ لڑکی مل جائے تو میں شادی کرلوں' اس کے سارے کپڑے بھی دھلوا دوں گا۔"

اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

لڑکی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ میرے جمن کے مکان میں کیا کر رہے ہو؟"

نادر نے کہا۔ "یہ میرا مکان ہے۔ جمن میرا ملازم ہے۔ وہ میری لانڈری میں کام کرتا ہے۔"

لڑکی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "ارے جا بابو! لانڈری کا سوٹ پہن کر اس مکان کا مالک بن بیٹھا ہے۔ جمن سے میری بات ہو گئی ہے۔ وہ میرے سے شادی کرے گا' میرے کو اس مکان میں رکھے گا اور روز میرے کپڑے دھویا کرے گا۔"

نادر نے سر کھجاتے ہوئے جمن کو آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ پھر لڑکی کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ نادر نے پوچھا۔

"ابے یہ کیا حرکت ہے؟ کیا تو شادی کرنے کے بعد اسے میرے مکان میں رکھے گا؟"

جمن نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ناراض نہ ہونا بھیا! میں نے سوچا تھا کہ اب تو آپ جیل جاتے ہی رہیں گے اور یہ گھر خالی پڑا رہے گا اس لئے یہ میرے بیوی بچوں کے کام آئے گا۔"

نادر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "اچھا ادھر آ۔ تجھ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

کمرے میں پہنچ کر اس نے آنگن کی طرف دیکھا کہ کہیں لڑکی تو نہیں آرہی ہے۔ مگر وہ اسی طرح دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے رازدرانہ انداز میں پوچھا۔

"ابے تو نے یہ لڑکی کیسے پھانس لی؟"

جمن نے شرماتے ہوئے کہا۔ "کیا بتاؤں بھیا........ ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے اسے پھانسا ہے یا اس نے مجھے پھانس لیا ہے۔ یہ غریب لڑکی ہے' اس کے پاس

کپڑوں کی دھلائی کے لیے پیسے نہیں تھے‘ میں نے مفت دھلوا دیئے۔ تب سے یہ مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔ اگر مہنگائی نہ بڑھتی‘ اگر دھلائی کا ریٹ نہیں بڑھتا تو یہ مجھ جیسے دھوبی کے بجائے کسی شہزادے کا خواب دیکھتی رہتی۔“

نادر آنگن کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ہمارے یہاں اتنی مہنگائی بڑھ گئی ہے کہ لڑکیاں اپنے میلے کپڑے دھلوانے کے لئے اپنا اجلا تن پیش کر دیتی ہیں؟

”کیوں بے وہ تیرے پاس اس کمرے میں آتی ہے؟“

”آتی ہے۔ کبھی کپڑے دھلانے کے لیے آتی ہے اور کبھی ہی ہی ہی.........“

یہ اس کے شرمانے کا انداز تھا۔ نادر نے اس کی پیٹھ پر دھپ جماتے ہوئے کہا۔

”چل بھاگ یہاں سے۔ اب اگر وہ شادی سے پہلے یہاں آئے گی تو میں تجھے لانڈری سے نکال دوں گا۔“

وہ بھاگتا ہوا پچھلے دروازے کی طرف چلا گیا۔ نادر نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

”میں ایک اجلی پاکیزہ اور شفاف زندگی کے لئے جیل سے باہر آیا ہوں۔ مجھے وہ پیار نہیں چاہیے جو لانڈری کے غلیظ کپڑوں میں لپٹ کر آئے۔ میں اپنے دماغ کی لانڈری سے اپنی اس دنیا کی غلاظت دھونے کی کوشش کروں گا۔ کسی ایسی لڑکی کو اپناؤں گا جو غربت اور مہنگائی کے دھکے کھا کر میرے پاس نہ آئے۔ بلکہ میں اس کے عورت پن سے متاثر ہو کر اس کی طرف بڑھوں گا۔ میرا آئیڈیل ایسی ہی لڑکی ہے۔“

وہ مکان سے باہر آکر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں نکل پڑا۔ مگر اپنی من پسند لڑکی راستہ چلتے نہیں مل جاتی۔ وقت کے جوئے شیر کو کھودتے رہنا پڑتا ہے۔ تب کہیں وہ نہر کسی شیریں کے مکان تک پہنچتی ہے۔ ایک ماہ گزر گیا۔ اس فرہاد کو شیریں نہ ملی۔ کیونکہ ملاوٹ کے بازار میں خالص عورت بہت مشکل سے ملتی ہے۔

جیل سے رہا ہونے کے دو دن بعد اسے علاقے کے تھانے میں بلایا گیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو تھانے کے انچارج کے پاس اس کے محلے کے چار شریف آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے نادر کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا تو تمام شریف آدمی اسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ قانون کا محافظ ایک سزا یافتہ شخص سے استقبالیہ انداز میں ہاتھ ملا رہا تھا۔ پھر نادر کو بھی سب کے برابر بیٹھنے کے لئے کرسی دی گئی۔ انسپکٹر نے

اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نادر! جیل سے تمہارا ریکارڈ میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس ریکارڈ میں جیلر کا ایک خط ہے۔ جس میں ڈی۔ آئی۔ جی کے سفارشی دستخط بھی شامل ہیں۔ لہٰذا کبھی آدھی رات کو بھی مجھے تمہارے کام آنا پڑا تو میں انکار نہیں کروں گا۔“

نادر کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں۔ اس نے کہا۔

”انسپکٹر صاحب! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا اور کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ کبھی میرے خلاف کوئی شکایت آئے تو آپ مجھے بھی اپنے طور پر صفائی پیش کرنے کا موقع دیں۔“

”بے شک۔ میں نے اسی لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ تمہارے محلے کے یہ چار شریف آدمی تمہارے خلاف کچھ کہنے آئے ہیں۔ میں نے ان کی زبان سے تمہارا نام سنتے ہی صاف صاف کہہ دیا کہ جس کی شکایت کی جا رہی ہے‘ پہلے اسے سامنے بلایا جائے گا۔ اب تم آگئے ہو اس لئے میں تمہارے سامنے ان سے پوچھتا ہوں کہ انہیں تم سے شکایت کیا ہے؟“

ایک شریف آدمی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! جب قانون نادر صاحب کی حمایت کر رہا ہے تو پھر ہماری کیا مجال ہے کہ ہم کچھ بولیں۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”اگر نادر کی کوئی غلطی ہوگی تو قانون اس کی بے جا حمایت نہیں کرے گا۔ جو کچھ کہنا ہے آپ بلاجھجک کہیں۔“

دوسرے شریف آدمی نے کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمارے گھروں میں جوان بہو بیٹیاں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے محلے میں ایسا کوئی شخص نہ رہے جو بیوی بچوں والا نہ ہو اور جس کا ریکارڈ پہلے سے خراب ہو۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں ہم راتوں کو سکون سے نہیں سو سکتے۔“

”جی ہاں۔“ تیسرے نے کہا۔ ”ہمیشہ چوری کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”آپ لوگوں کو صرف اس بات کا ڈر ہے کہ آپ کے یہاں چوری نہ ہو جائے۔ میں یہاں کے تھانے کا انچارج ہوں۔ ابھی یہاں کا رجسٹر کھول کر دکھا سکتا ہوں کہ ایک سال کے دوران جب نادر جیل میں تھا تو آپ کے محلے میں کتنی چوریاں ہو چکی

ہیں۔ بہت سے چور پکڑے گئے۔ جو باقی بچے ہیں وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ نادر کا ان چوریوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر آپ لوگ نادر کی موجودگی میں سکون سے کیوں نہیں سو سکتے؟"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھاگئی۔ شاید وہ لوگ جواب سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر نے کہا۔

"ہم پولیس والے چوروں اور بدمعاشوں کے ایک اصول کو اچھی طرح جانتے ہیں اور تسلیم بھی کرتے ہیں کہ کوئی چور یا بدمعاش اپنے محلے میں چوری اور بدمعاشی نہیں کرتا۔ ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کی جیب سے کچھ چھین سکتا ہے۔ مگر ایک جیب کترا دوسرے جیب کترے کی جیب کبھی نہیں کاٹتا۔ بدمعاش کے دل میں بھی تھوڑی بہت ایمانداری ضروری ہوتی ہے۔"

نادر نے کہا۔ "جناب! میں اس شہر کے تقریباً سبھی چوروں اور بدمعاشوں کو جانتا ہوں۔ میں ان شریف آدمیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میری موجودگی میں کوئی بدمعاش ہمارے محلے میں داخل نہیں ہو سکے گا۔"

کسی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ وہ نادر کی باتوں کا یقین نہیں کر رہے تھے۔

انسپکٹر نے ان سے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں میں سے کسی کی بہو بیٹی کو یہ شکایت ہے کہ نادر ان پر میلی نظر ڈالتا ہے؟"

ایک شریف آدمی نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"کس کی مجال ہے کہ ہماری بہو بیٹیوں پر بری نظر ڈالے۔ ہم اس کا جینا محال کر دیں گے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اگر آپ لوگوں کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہے تو پھر یہاں کس بات کی شکایت کرنے آئے ہیں؟ ایک شخص آپ کی طرح شریفانہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اگر آپ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے تو ایسے مجرموں کو قانون کے ذریعے کہاں تک راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے؟ میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی ہمدردی اور محبت سے اور اپنے پُرخلوص تعاون سے نادر کو ایک اچھی زندگی گزارنے کا موقع دیں۔ جب ہم سب مل کر اس کی عزت کریں گے تو یہ بھی اس عزت کو برقرار

رکھنے کے لئے ہم میں سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دے گا۔"

انسپکٹر انہیں بہت دیر تک سمجھاتا رہا اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے مجبوراً اپنی گردنیں ہلاتے رہے۔ پھر وہ سب نادر سے تعاون کا وعدہ کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نادر سے انسپکٹر نے کہا۔

"اس دنیا میں اپنے لئے ایک اچھا مقام بنانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے لوگ عجیب ہیں۔ کسی کو نیچے گرتے دیکھ کر ہمدردی کرتے ہیں اور کسی کو اوپر پہنچتے دیکھ کر مارے حسد کے شکایتیں کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تم نے کچھ سوچا ہے کہ ایسے ماحول میں اپنے لئے کس طرح جگہ حاصل کر سکو گے؟"

"مجھے جیلر صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ میں تنہا رہوں گا تو سب مجھے آوارہ بدمعاش کہنے لگیں گے۔ لہٰذا مجھے کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہئے کیونکہ بیوی بچوں سے اور ایک اچھے گھر سے اس سماج میں عزت بنتی ہے۔"

انسپکٹر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "بہت اچھا مشورہ ہے۔ تمہیں جلد ہی اس پر عمل کرنا چاہئے۔"

"مگر کون مجھے اپنی بیٹی دے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اپنی غربت سے مجبور ہو کر مجھے ایک بدمعاش سمجھتے ہوئے بھی اپنی بیٹی یا بہن کو میرے پلے باندھ دے۔ میں دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا گھر نہیں بساؤں گا۔ میں اس کی تلاش میں ہوں جو مجھے محبت سے گلے لگائے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھ گیا۔ انسپکٹر نے اس سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں کسی اچھی لڑکی کا رشتہ ضرور ملے گا۔"

اس کے بعد نادر محبت کی تلاش میں چل پڑا۔ مگر یہ بظاہر مفت حاصل ہونے والی چیز دنیا میں سب سے مہنگی ہے۔ اسی لئے اس کی تلاش میں بھٹکتے رہنا پڑتا ہے۔ ایک ماہ کے بعد اس نے ہل پارک میں ایک لڑکی دیکھی۔ اگر صرف وہی دیکھتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھنے کے بعد ہمیشہ کی طرح مایوس ہو کر اس کے پاس سے بھی گزر جاتا لیکن اس لڑکی نے بھی اسے دیکھا تھا۔ ایک بار دیکھ کر پھر دوسری بار دیکھا تھا۔ جب تیسری بار بھی دیکھا تو

لڑکھڑا کر گھاس کے فرش پر بیٹھ گیا۔

ایسے تو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بڑی مدت کے بعد اس کے دل کے شکستہ دروازے پر کسی کی نگاہوں نے تین بار دستک دی تو وہ دروازہ کھول کر گھاس کے فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ذرا دور روش کے کنارے ایک بینچ پر اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نادر ایک شاعر کی طرح اس کے حسن کا تجزیہ نہیں کر سکا۔ بس اس کے لئے اتنا ہی دیکھ لینا کافی تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور اسے تین بار دیکھ چکی ہے۔ تین کا عدد بہت اچھا ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰی تین بار توبہ قبول کرتا ہے۔ وہ سال کے تیسرے مہینے کی تین تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے مکان کے کمرے تین تھے۔ وہ تین بار جیل جا چکا تھا۔ نکاح میں تین بار قبولنا پڑتا ہے اور یہ لڑکی تین بار اسے دیکھ چکی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر پارک کے ریسٹورنٹ میں چلی گئی تھی۔ نادر نے بھی اس کا پیچھا کیا۔ پھر وہاں پہنچ کر ایک خالی میز کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس سے ذرا دور ایک میز پر وہ بیٹھی ہوئی پھر اسے دیکھ رہی تھی۔ بیرا اس کے سامنے ٹھنڈی بوتل رکھ رہا تھا۔ اس نے بیرے کو بلا کر ویسی ہی ایک ٹھنڈی بوتل کا آرڈر دیا۔ جب بوتل اس کے سامنے آ گئی تو اس نے دیکھا کہ لڑکی مشروب کو ایک گلاس میں ڈال رہی ہے۔ وہ بھی اپنی بوتل کے مشروب کو ایک گلاس میں انڈیلنے لگا۔ لڑکی نے گلاس اٹھا کر ایک ہلکی سی چسکی لی پھر گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ لڑکی اس کی یہ حرکت دیکھ کر اپنا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔ وہ اپنا کالر درست کرنے لگا۔

کچھ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ پینے کے لئے گلاس اٹھاتی تو نادر بھی اپنا گلاس اٹھا لیتا۔ ایک بار لڑکی کو اچانک ہی چھینک آنے لگی۔ اس نے آں آں۔" کہہ کر چھینکنے کے لئے منہ کھولا تو نادر کا بھی منہ کھل گیا۔ لڑکی کی چھینکیں اصلی تھیں اور نادر کی نقلی۔ مگر دونوں کی چھینکوں سے ایسے جھٹکے لگے کہ دونوں کے گلاس ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑے۔ ریسٹورنٹ کے بیرے اور دوسرے لوگ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگے۔ کیونکہ دونوں کو بیک وقت چھینکنے کا حادثہ پیش آیا تھا۔ جب بیرے دونوں میزوں کو صاف کر کے چلے گئے تو لڑکی کا باپ نادر کے پاس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے کہنے لگا۔

"میاں صاحبزادے! عشق کی ابتداء میں اسی طرح زکام ہوتا ہے اور چھینکیں آتی ہیں۔ میں بہت دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں صاف گوئی کا عادی ہوں اس لئے فٹافٹ

میرے سوالوں کا جواب دو۔ کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"جی نہیں۔ میں کنوارا ہوں۔"

"کرائے کے مکان میں رہتے ہو یا اپنا مکان ہے؟"

"جی .... اپنا مکان ہے۔"

"ملازمت کرتے ہو یا کاروبار؟"

"دھلائی کا کاروبار کرتا ہوں۔ ناظم آباد میں میری ایک لانڈری ہے۔"

"تمہارے ماں باپ کتنے ہیں.........سوری رشتے دار کتنے ہیں؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"تو پھر میری بیٹی سے شادی کیسے کرو گے؟ کوئی تو تمہارا سرپرست ہونا چاہئے۔ تمہارے اپنوں میں کوئی تمہاری ضمانت دینے والا ہو کہ تم اچھے کردار کے مالک ہو۔"

نادر نے بڑے فخر سے کہا۔ "جی میرے علاقے کا تھانیدار میری ضمانت دے گا۔"

"کک .... کیا مطلب؟" لڑکی کا باپ کرسی کھسکا کر جلدی سے ذرا پیچھے چلا گیا۔

"تھانے میں تو چور بدمعاشوں کی ضمانت ہوتی ہے۔ کیا......... کیا تم.........؟"

"جی ہاں۔ مگر اب میں ایک شریف آدمی بن گیا ہوں۔ سینٹرل جیل کے جیلر صاحب' پولیس کے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب اور میرے علاقے کے تھانیدار صاحب اس بات کی گواہی دیں گے کہ اب میں شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"یہ تم جتنے افسروں کا حوالہ دے رہے ہو' ان کا تعلق تو چور بدمعاشوں سے ہوتا ہے۔ تم یقیناً سزا یافتہ ہو' اسی لئے ان سے جان پہچان ہو گئی ہے۔ ورنہ کوئی شریف آدمی ایسے افسروں کی ضمانت نہیں دلواتا۔"

"دیکھئے جناب! آپ کو میرے ساتھ نیکی کرنا چاہئے۔ میں آپ جیسے شریف آدمی کی بیٹی سے شادی کر کے عزت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"ارے تو میری بیٹی کا کیا جرم ہے کہ میں اسے تمہارے ساتھ بیاہ کر بے عزت کروں.........بس خبردار! اب میری بیٹی کا ذکر اپنی زبان پر نہ لانا۔ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا' نہ ہی اس کا پیچھا کرنا' ورنہ میں تھانے میں جا کر تمہاری شکایت کروں گا۔"

یہ دھمکی دے کر بوڑھا اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنا بل ادا کیا۔ پھر اپنی بیٹی اور بیوی کو لے کر اسے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بس اتنی ہی دھمکی کافی تھی کہ

تھانے میں اس کے خلاف رپورٹ پہنچائی جائے گی۔ اب وہ اس لڑکی کا پیچھا کر کے اپنا ریکارڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا......... ہائے وہ خوبصورت لڑکی جو اسے محبت سے دیکھ رہی تھی، نفرت سے چھین لی گئی تھی۔ زندگی میں جسے پہلی بار چاہا اس کے چھن جانے کے بعد یہ تجربہ ہوا کہ صرف عشقیہ انداز میں آنکھیں لڑانے سے لڑکی حاصل نہیں ہوتی۔ قانون کے محافظ ضمانت دیں تب بھی اس حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نہیں آتا۔ کیونکہ لڑکی والے لڑکے کے اب تک کے چال چلن کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ سزا یافتہ ہے تو پھر یہ کون یقین کر سکتا ہے۔ یا یقین دلا سکتا ہے کہ شادی کے بعد اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک ہو جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ سب ہی لڑکی والے تعلیم یافتہ اور آمدنی یافتہ لوگوں کو پوچھتے ہیں اور سزا یافتہ پر تھوکتے بھی نہیں۔

وہ کئی دنوں تک اس لڑکی کے فراق میں آہیں بھرتا رہا۔ کئی بار اس پارک میں گیا کہ دور ہی سے چھپ کر اسے ایک نظر دیکھ لے۔ تڑپتے ہوئے دل کو ذرا تو قرار آئے۔ مگر وہ پھر کبھی نظر نہیں آئی۔ شاید اس کے ماں باپ نے وہاں اس لئے جانا چھوڑ دیا تھا کہ اب اس پارک میں ایک سزا یافتہ آیا کرتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے دل کو سمجھا لیا کہ وہ حسینہ انتقال فرما گئی ہے' اسی لئے نظر نہیں آتی۔ مرنے والی پر زندگی بھر آنسو بہانا دانش مندی نہیں ہے۔

☆======☆======☆

تین ماہ کے بعد پھر ایک لڑکی ٹکرا گئی۔ سچ مچ ٹکرا گئی۔ کیونکہ شہر میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ پولیس لاٹھی چارج کر رہی تھی اور وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی اس سے آکر ٹکرا گئی اور بدحواسی میں کہنے لگی۔

"مم......... مجھے بچاؤ میں نے کسی انقلابی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ یہ پولیس والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے......... مجھے بچاؤ۔"

وہ اس کا بازو تھام کر اسے کھینچتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ بازو تھامنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ کتنی گداز ہے۔ وہ چاروں طرف کے ہنگاموں کو بھول گیا۔ کیونکہ اس کے بدن کے ہنگامے سانس لے رہے تھے۔ وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑتا ہوا پھر تیسری گلی سے گزرتا ہوا بار بار اس کے سانولے سے نمکین چہرے کو دیکھتا تھا۔ سمندر کی نمکین لہروں کی طرح وہ اس کے ایک ہاتھ کی گرفت میں بل کھاتی جا رہی تھی۔ وہ پارک والی لڑکی کو

بالکل ہی بھول گیا کیونکہ اپنے ساتھ چلنے والی لڑکی کی محبت کا شعلہ ایک دم سے دل میں بھڑک گیا تھا۔ وہ پولیس والوں کو دعائیں دینے لگا کیونکہ انہوں نے لاٹھی چارج کر کے اس کے دل میں محبت کی بیٹری چارج کر دی تھی۔

چوتھی گلی میں پہنچ کر وہ ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ پھر ہانپتی ہوئی بولی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میرا گھر آ گیا۔ آپ بہت اچھے ہیں آپ نے میری جان بچائی ہے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

نادر نے سوچا کہ باتوں کے ذریعے اسے تھوڑی دیر تک روکنا چاہئے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے کہا۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ تم اتنی اچھی ہو کہ میں تمہارے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہوں......... چاہو تو آزما لو۔"

لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر نادر سے نظریں ملتے ہی جلدی سے سر جھکا لیا۔ اس کے رخساروں کی شرمیلی رنگت بتا رہی تھی کہ زندگی میں پہلی بار کوئی اس کے لئے جان کی بازی لگانے والا آیا ہے۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنے مکان کے برآمدے کی طرف جانے لگی۔ اس کی ٹھہری چال سے پتہ چل رہا تھا جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو۔ سمندر کی نمکین لہر اپنے ساحل پر پہنچ کر آہستہ روی سے تھم رہی ہو۔

"تم اپنی منزل پر پہنچ گئیں۔ اب میں نہ جانے کہاں بھٹکتا رہوں گا۔ باہر ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پھر پولیس کے ڈنڈوں کا سامنا ہو جائے۔"

لڑکی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اب وہ منزل پر پہنچانے والے کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ وہ فوراً ہی بولی۔

"آپ ذرا ٹھہریئے میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر چلی گئی۔ برآمدہ اس کے وجود سے خالی ہو گیا۔ مگر وہ نادر کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔ اب تک نظر آ رہی تھی۔ اس نے کھڑے ہی کھڑے دعا مانگی۔

"یا الٰہی بیڑا پار لگا دے۔ تُو میری نیک نیتی کو سمجھتا ہے۔ میں اس لڑکی کو اپنی عزت بنا کر اس معاشرے میں عزت سے مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جس گھر میں بیوی بچوں کی محبت ہوتی ہے لوگ اس گھر والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیلر صاحب نے بہت

اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں اتنی بڑی دنیا میں اپنا ایک چھوٹا سا گھر بساؤں گا۔"

دعا مانگنے کے دوران ایک بوڑھی خاتون نے دروازہ کھول کر اس سے کہا۔

"بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو' اندر آجاؤ۔ باہر کے ہنگامے ختم ہو جائیں تو پھر چلے جانا۔"

بوڑھی خاتون کو سلام کرتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر خاتون کی رہنمائی میں دروازے سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔ وہ کمرہ قیمتی فرنیچر اور دوسرے آرائشی سامانوں سے سجا ہوا تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ ان کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ خاتون نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! تم اچانک ہی فرشتہ بن کر آئے ہو' ورنہ اس ہنگامے میں صائمہ بری طرح زخمی بھی ہوتی اور انقلابی سمجھ کر پکڑی بھی جاتی۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ملک کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اسے باہر نہیں جانا چاہئے۔ مگر یہ آج کل کی لڑکیاں ہماری سنتی کب ہیں۔"

نادر نے کہا۔ "اب آپ کی صاحبزادی آپ کی بات مان لیا کریں گی کیونکہ اس ہنگامے سے بری طرح سہمی ہوئی ہیں۔"

"ہاں۔ ٹھوکر کھانے کے بعد ہی عقل آتی ہے۔ اس دنیا میں عجیب عجیب تماشے ہوتے ہیں۔ مجھ جیسی جہاندیدہ عورت بھی بیٹی کے سلسلے میں ایک بار ٹھوکر کھا چکی ہے۔"

"اچھا۔ وہ کیسے؟"

"کیا بتاؤں بیٹا .... دو سال پہلے میں نے صائمہ کے لئے ایک لڑکا پسند کیا۔ صائمہ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ ہمارے بعد ہمارا سب کچھ اسی کا ہے۔ اس کے ابا چاہتے تھے کہ لڑکا گھر داماد بن کر رہے۔ ان کی خواہش کے مطابق لڑکا بھی راضی ہو گیا۔"

نادر کا دل ڈوبنے لگا۔ دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ صائمہ بھی ہاتھ آنے سے پہلے ہی بچھڑ جائے گی۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا لڑکے کے ماں باپ بھی راضی ہو گئے تھے؟"

"اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کا کوئی دوسرا رشتے دار بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا تنہا لڑکا ہے۔ داماد بن کر آئے گا تو ہم ہمیشہ اسے بیٹے کی طرح چاہیں گے۔ اس لئے ہم نے صائمہ سے اس کی شادی کر دی۔"

نادر نے مایوسی سے پوچھا۔ "اچھا۔ صائمہ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"بس نام کی شادی ہوئی تھی بیٹا......... وہ تو سہاگ رات کو میری بیٹی کے کمرے میں آیا۔ میری بیٹی کیا جانتی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس نے صائمہ کو سمجھایا کہ دولہا اپنے ہاتھوں سے دلہن کے زیورات اتارتا ہے۔ اس نے زیورات اتارنے کی رسم پوری کرلی۔ رونمائی کی رسم میں جتنے روپے ملے' وہ تمام روپے اور زیورات سمیٹ کر کھڑکی کے راستے سے بھاگ گیا۔ یہ بدنصیب لڑکی گھونگٹ میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ صبح' اذان ہونے تک انتظار کرتی رہی کہ اس کا دولہا پھر اس کے پاس آکر اور گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھے گا۔ صبح میں نے دروازے پر دستک دی تو اسے ہوش آیا۔ مگر اس وقت تک سب کچھ لٹ چکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بیٹی سہاگن بننے کے باوجود کنواری ہے۔ اس کی عزت محفوظ رہ گئی۔"

نادر سر کھجا کر سوچنے لگا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ بھی اس دنیا میں اکیلا تھا اور اس سے پہلے ہی اس دنیا کا ایک اور اکیلا آدمی صائمہ کو اور اس کے والدین کو زبردست چرکہ دے کر چلا گیا تھا۔ خاتون کہہ رہی تھیں۔

"اللہ کے فضل سے ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ہمیں اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ جس پر بھروسہ کیا وہ کم ظرف نکلا۔ مگر صائمہ کچھ عرصے تک پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس کے دل کو زبردست صدمہ پہنچا تھا۔ ایک سال بعد ہم نے ایک بڑے عالم سے رجوع کیا۔ انہیں صائمہ کے حالات بتائے تو انہوں نے کہا کہ نکاح کے بعد مرد خاوند بننے کے بجائے چور بن کر آئے' اپنی منکوحہ کا منہ تک نہ دیکھے۔ پھر سال بھر تک اس کے نان و نفقے کی ذمہ داریاں قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں طلاق ہو جاتی ہے۔ ہم صائمہ کی شادی اب دوسری جگہ کر سکتے ہیں .... اے بیٹا! میں تو باتیں کئے جا رہی ہوں۔ تمہیں ایک پیالی چائے کو بھی نہ پوچھا۔ ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ چائے لانے کے لئے گئیں تو نادر کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ بار بار صائمہ کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو شخص اتنی خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی کو دلہن بنا کر اس کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر اور اسے دیکھے بغیر تھوڑے سے زیورات چرا کر لے گیا ہے اس سے زیادہ احمق اور بدنصیب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ر وہ صائمہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا تو اسے خوبصورت بیوی بھی ملتی اور وہ عزت

کی زندگی بھی گزارتا رہتا۔ جو لوگ عزت کو کچھ نہیں سمجھتے وہی مٹھی بھر روپے چرا کر خوش ہو جاتے ہیں۔

کاش کہ صائمہ مجھے مل جائے۔ یہ دولت مند والدین کی اکلوتی بیٹی ہے لیکن مجھے دولت کا لالچ نہیں ہے' صرف صائمہ کی ضرورت ہے۔ یا خدا! مجھے صائمہ کے ساتھ عزت کی زندگی گزارنے کا موقع دے۔

تھوڑی دیر بعد صائمہ ایک ٹرے میں چائے لے کر آئی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر پیالی میں چائے انڈیلنے لگی۔ اسی دوران اسے صائمہ کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ بڑی من موہنی سی صورت تھی۔ ہاتھ بڑھا کر گرم پیالی اٹھانے کے بجائے اس کے حیا سے تپتے ہوئے چہرے کو ہاتھوں میں لینے کو جی چاہتا تھا۔ مگر اسے چائے کی پیالی اٹھانی پڑی۔ اس نے چائے پیتے وقت پیالی کے اُفق سے اس کے متبسم لبوں کو دیکھا' پھر دل ہی دل میں کہا۔

"چائے ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح ہے۔ جس میں گرمی بھی ہے اور مٹھاس بھی۔"

مگر وہ گرمی اور مٹھاس جلد ہی اٹھ کر چلی گئی کیونکہ اس کی والدہ آگئی تھیں۔ انہوں نے صائمہ کی جگہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! تم کہاں رہتے ہو؟"

وہ بتانے لگا کہ نظام آباد میں اس کا تین کمروں کا ذاتی مکان ہے۔ اسی جگہ اس نے ایک لانڈری کھول رکھی ہے۔ خاتون نے پوچھا۔

"کیا تمہارے والدین تمہارے ساتھ رہتے ہیں؟"

"جی .... جی ہاں۔" اس کی زبان سے ایک جھوٹ بات نکل گئی۔ اس سے پہلے اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی مگر حالات کے پیش نظر جھوٹ خود بخود اس کی زبان سے نکل گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ خود کو اس دنیا میں تنہا بتا کر ماں بیٹی کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"گھر میں اور کون کون ہے؟"

اس کے دماغ نے مزید جھوٹ بولنے پر اکسایا کہ صرف ماں باپ کا ذکر کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ دوسروں کے بھائی بہن بھی تو ہوا کرتے ہیں۔"

"ایک بہن اور ایک بھائی ہے۔"

"اور بیوی بچے؟"

"جی ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔"

"اچھا۔ اچھا۔" خاتون خاموش ہو کر سرہلانے لگیں۔ "کہیں رشتے کی بات چل رہی ہو گی؟"

"جی نہیں۔ کہیں لڑکی پسند آتی ہے تو میں یہ سوچ کر رشتہ نہیں مانگتا کہ وہ انکار نہ کر دیں۔"

"اے بیٹا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ لڑکی والے تو ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی رشتہ مانگنے آئے تو جلدی سے یہ بوجھ اتار دیں۔"

نادر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے آپ کی باتوں سے مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ کیا میں .... میں آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگ سکتا ہوں؟"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اے بیٹا! تم تو بڑے جلد باز نکلے تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ تم دستور کے مطابق اپنے والدین کو یہاں بھیجو۔ میں ان سے ملوں گی' کچھ سوچوں گی' کچھ سمجھوں گی پھر جواب دوں گی۔"

نادر کا منہ لٹک گیا۔ وہ صائمہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے مردہ والدین کو کیسے زندہ کر سکتا تھا؟ اس نے جھوٹ بولتے وقت اتنی دور تک نہیں سوچا تھا کہ رشتے کی بات اگر چلے تو پہلے اپنے ماں باپ کو پیدا کرنا ضروری ہو گا۔ خاتون نے پوچھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے ماں باپ راضی نہیں ہوں گے۔"

اس نے جلدی سے کہا۔ "جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری پسند میرے والدین کی پسند ہوتی ہے۔ مگر مگر اصل بات یہ ہے کہ میرے والدین نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" خاتون نے چونک کر پوچھا۔ "کیا ابھی تم مجھ سے جھوٹ کہہ رہے تھے؟ تم آج کل کے چھوکرے لڑکی والوں کو اس طرح دھوکا کیوں دیتے ہو؟"

نادر نے سمجھ لیا کہ بازی ہاتھ سے جا رہی ہے۔ اس طرح تو وہ کبھی کسی لڑکی کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔

"آ .... آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ میری بزرگ ہیں آپ سے جھوٹ نہیں

بولوں گا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرے والدین یہاں نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں؟" خاتون ذرا نرم پڑ گئیں۔

"جی......... میرے والد صاحب حج کرنے گئے ہیں۔" وہ جلدی میں یہی جھوٹ بول سکا۔

"تمہاری والدہ اور بہن بھائی تو ہوں گے؟"

"جی نہیں۔ وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ میں انہیں خط لکھ کر یہاں بلوا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولیں۔ "تمہاری والدہ آجائیں تو تم انہیں یہاں کر لے آنا۔ بیٹی صائمہ یہ چائے کی پیالیاں اٹھا کر لے جاؤ۔"

جواباً صائمہ کی آواز نہیں آئی۔ وہ پیالیاں اٹھا کر بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"یہ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہے۔ گھر میں ذرا چین سے نہیں بیٹھتی۔ ضرور پڑوسن کے یہاں چلی گئی ہوگی۔"

نادر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ باہر ہنگامے ختم ہو چکے ہوں گے۔"

خاتون نے واپس آکر کہا۔ "اچھا بیٹا! سنبھل کر جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔ اپنی والدہ کو ضرور لے کر آنا۔"

وہ بڑے ادب سے سلام کرکے مکان سے باہر آگیا۔ باہر آتے وقت وہ کچھ اداس سا تھا کیونکہ صائمہ پر الوداعی نظر نہ ڈال سکا تھا لیکن اس کی اداسی تھوڑی دیر کی تھی۔ جب وہ آگے بڑھا تو دو گھر کے بعد تیسرے گھر کے دروازے پر صائمہ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل گیا۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے' ذرا سنبھل کر جائیے گا۔ میں سوچتی رہ جاؤں گی کہ آپ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اب میں تمہارے لئے اپنی حفاظت کروں گا۔ اگر کل ہنگامہ نہ ہوا تو میں اسی جگہ اپنی خیریت کی اطلاع دینے آؤں گا جہاں تم مجھ سے ٹکرائی تھیں۔"

وہ جواب سنے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ تمام راستے صائمہ کی محبت کا یہ انداز اسے لبھاتا رہا کہ وہ اس کے لئے فکر مند تھی۔ اس کے لئے ایک پڑوسی کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر اس کی خاطر تیسرے دروازے تک آئی تھی۔

کیا وہ اسے وہاں سے آگے بڑھا کر اپنے گھر کے دروازے تک لا سکتا تھا؟

اپنے دروازے تک اسے لانے کے لئے اب بہت سے جھوٹ کو نبھانا تھا اور جھوٹ کو نبھانے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ شادی کے بعد بچے پیدا کر سکتا تھا مگر ماں باپ کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ پھر ایک بھائی اور بہن کی بھی ضرورت تھی۔ وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ صائمہ اس کے قریب آکر دور ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ سیدھا تھانیدار کے پاس پہنچ گیا۔ اسے شروع سے آخر تک تمام باتیں بتانے کے بعد اس نے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب! اب میں کیا کروں؟ پہلی بار سچ کہا تو ایک لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔ صائمہ بہت اچھی لڑکی ہے' بہت پیاری پیاری سی لڑکی ہے۔ اگر میں اس سے شادی نہ کر سکا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں اس کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ آپ میرے لئے کچھ کریں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم نے جھوٹ بول کر الجھا دیا ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سچ بولتے رہو گے تو اچھے گھرانے کے لوگ کبھی تمہیں بیٹی نہیں دیں گے۔ میں تمہیں جھوٹ بولنے کی ترغیب نہیں دے رہا ہوں مگر بعض حالات میں کسی نیک مقصد کی خاطر جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ بہت سے ڈاکٹر مریضوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر بھی زندہ رکھتے ہیں۔ تم بھی اس معاشرے کے کچھ لوگوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر جھوٹے والدین بھی بنا کر ایک باعزت زندگی گزارنے کی ابتداء کر سکتے ہو۔ کسی کو اپنی ماں اور کسی کو اپنا باپ بنانا کوئی جرم نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

نادر نے جلدی سے کہا۔ "تو بس انسپکٹر صاحب! آپ میرے باپ بن جائیں۔"

"آں......... میں......... مگر میں تمہارا باپ کیسے بن سکتا ہوں؟ دیکھو نا تم تقریباً تیس برس کے ہو اور میں پینتیس برس کا ہوں۔ یہ تو ماننے والی بات نہیں ہے کہ میں نے پانچ برس کے بعد ہی تمہیں پیدا کیا ہو۔ کسی معمر مرد اور عورت کو تلاش کرو۔ ایسے بہت سے لوگ مل جائیں گے جو اولاد کے لئے ترستے ہیں۔ انہیں ایک بیٹا مل جائے گا اور تم والدین کی کمی پوری کر لو گے۔"

پہلے ایک لڑکی کی تلاش تھی۔ لڑکی مل گئی تو وہ ماں باپ کی تلاش میں نکل پڑا۔ زندگی کے بہت سے موڑ پر اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ بچوں کے لئے ماں باپ کا وجود

کتنا ضروری ہوتا ہے لیکن وہ کس کے گھر میں جھانک کر یہ کہہ سکتا تھا کہ تم اولاد سے خالی ہو تو میرے گھر آ کر میرے ماں باپ بن جاؤ۔

☆======☆======☆

دوسرے دن وہ اسی جگہ پر پہنچا جہاں صائمہ اس سے ٹکرائی تھی۔ اس سے ملنے کی ایسی بے چینی تھی کہ وہ صبح پانچ بجے ہی وہاں پہنچ گیا۔ جبکہ نو بجے سے پہلے صائمہ وہاں نہ آتی۔ مگر وہ اپنے گھر میں رہ کر کیا کرتا؟ تڑپتا ہی رہتا۔ لہٰذا اسی جگہ تڑپنے کے لئے آگیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دکانوں اور مکانوں کے دروازے بند نظر آرہے تھے۔ اس وقت وہ صرف المیہ گیت گا سکتا تھا۔ "آجاؤ تڑپتے ہیں ارماں........"

گانے کا بول دماغ میں آتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف آنے لگی۔ اس نے دور ہی سے دیکھا' وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کی بغل میں ایک گٹھری تھی اور وہ بڑی تیزی سے بھاگتی چلی آرہی تھی۔ اس کے پیچھے بہت دور دو چار آدمی چیختے چلاتے آرہے تھے۔ "دوڑو' پکڑو' بھاگنے نہ پائے۔" وہ بھاگنے والی اس کے قریب آتے ہی ایک گلی میں مڑ گئی اس نے آگے بڑھ کر گلی میں جھانک کر دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی ایک مکان کے برآمدے میں چلی گئی اور برآمدے کی اونچی دیوار کے پیچھے جا کر چھپ گئی تھی۔ ذرا دیر بعد تعاقب کرنے والے نادر کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے کسی عورت کو یہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے؟"

نادر نے کہا۔ "جی ہاں۔ وہ اس گلی میں گئی تھی۔ پھر آگے جا کر اس دوسری گلی میں دائیں طرف مڑ گئی۔ مگر بات کیا ہے؟"

"سالی چور ہے۔" اتنا کہتے ہی وہ سب بھاگتے ہوئے گلی میں گئے پھر آگے جا کر دوسری گلی میں مڑ گئے۔ نادر نہیں چاہتا تھا کہ وہ پکڑی جائے۔ کیونکہ پکڑنے والے تھانے میں پہنچانے سے پہلے چور کو بری طرح مارتے ہیں اور وہ ایک عورت کو مار کھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے وہ خود ہی اس عورت کو پکڑ کر تھانے پہنچانا چاہتا تھا۔ جب وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس برآمدے میں پہنچا۔ برآمدے کی اونچی دیوار کے پیچھے وہ نظر نہیں آئی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مکان کے اندر گھس گئی ہے۔

وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ دروازے کے پیچھے ایک

مرد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "دیکھو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم چور ہو۔ گھبراؤ نہیں میں بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔ پولیس والے مجھے نوسرباز کہتے ہیں۔ میں اِدھر کا مال اُدھر کرتا ہوں۔ تم اُدھر کا مال لے کر اِدھر آئی ہو تو پھر آدھا حصہ میرے پاس رکھ دو۔ پھر یہاں اطمینان سے رہو۔ اب دن نکلنے والا ہے بعد میں کسی وقت چلی جانا۔"

اس عورت کی آواز سنائی دی۔ "دیکھ رے نوسرباز! میری مجبوریوں سے فائدہ نہ اُٹھا۔ میں بڑی محنت سے چُرا کر لائی ہوں۔ تُو ایک جگہ بیٹھ کر پتے اِدھر اُدھر کر کے لوگوں کو لُوٹتا ہے۔ میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کر لوگوں کے گھروں میں گھستی ہوں۔ میں اپنے خون پسینے کی کمائی کا آدھا حصہ نہیں دے سکتی۔"

"وہ تو دینا ہی ہوگا۔ اگر سیدھی طرح نہیں دے گی تو ابھی شور مچا کر تجھے پکڑا دوں گا۔" نادر نے پہلے گلی کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پلٹ کر دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز پر کمرے کے اندر تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر چیزوں کے اِدھر اُدھر سرکنے کی آواز سنائی دی۔ دوسری دستک پر مرد نے پوچھا۔ "کون؟"

"دروازہ کھولو۔ پھر معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے۔"

نوسرباز نے ڈھٹائی سے کہا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ تم سویرے سویرے نیند خراب کرنے آئے ہو۔ یہ شریف آدمی کا مکان ہے؟ سمجھے" یہ کہتے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ نادر اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کمرے میں آیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا تم شریف آدمی ہو۔ وہ شریف عورت کہاں ہے؟"

نوسرباز نے کہا۔ "تم کس عورت کا پوچھ رہے ہو؟ دوسرے کمرے میں میری بیوی ہے' وہ پردہ کرتی ہے۔ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

نادر نے کہا۔ "اس لئے آیا ہو کہ اب اس مال میں سے تین حصے ہوں گے۔ زیادہ بحث کرو گے تو میں تمہیں اور تمہاری گھر والی کو تھانے لے جاؤں گا۔ چوری کا مال اسی کمرے میں سے برآمد ہو سکتا ہے۔"

وہ خوشامد پر اُتر آیا۔ "ہی ہی ہی تم اپنے ہی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم سے کیا جھگڑا کرنا۔" پھر اس نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے بڑی بی! یہاں آجا۔ یہ اپنی ہی برادری کا آدمی ہے۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ عورت دوسرے کمرے کے

دروازے پر نظر آئی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"ارے او بڈھے! تُو نے مجھے بڑی بی کیوں کہا؟ بوڑھی ہو گی تیری ماں' تیری بہن۔ ایک تو آدھا حصہ مانگتا ہے اُوپر سے میری بے عزتی کرتا ہے۔"

بوڑھے نوسرباز نے کہا۔ "اری جھگڑا کیوں کرتی ہو' تیری آواز باہر جائے گی تو کوئی چوتھا حصے دار بھی یہاں آ پہنچے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے چارپائی کے نیچے سے گٹھری نکال لی پھر اسے کھولنے لگا۔ کھلنے والی گٹھری میں سونے کے زیورات' ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر' ایک ٹائم پیس اور مسی کاجل اور پاؤڈر نظر آ رہا تھا۔ نوسرباز نے کہا۔

"عورت چوری کرتے وقت بھی اپنی جوانی کو برقرار رکھنے کا سامان ضرور تلاش کرتی ہے۔ چلو اب تم دونوں یہاں اطمینان سے بیٹھ جاؤ میں ایمانداری سے تین حصے کرتا ہوں۔"

نادر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "نہیں۔ اس گٹھری کو دوبارہ باندھ کر ایک طرف رکھ دو۔ میں اسے تھانے پہنچا دوں گا۔"

وہ دونوں خوفزدہ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں چاہتا تو وہ تعاقب کرنے والے اس عورت کو پکڑ لیتے اور اس کی بری طرح پٹائی کرتے لیکن مجھے اس کے بڑھاپے پر رحم آ رہا ہے۔ تم دونوں کی زندگی کتنی رہ گئی ہے۔ اب تو تمہیں حلال کی روٹی کھا کر مرنا چاہیے۔"

نوسرباز نے کہا۔ "برخوردار! حلال کے پیسوں سے روٹی خریدو تو وہ پیسے حرام میں جاتے ہیں۔ کیونکہ اس روٹی کے آٹے میں بھوسی ٹکروں کا برادہ ملا ہوتا ہے۔ حلال کے پیسے بھی ضائع جاتے ہیں۔ اس دُنیا میں کون ایماندار اور خالص آدمی ہے؟"

"بڑے میاں تقریر تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ لمبی چوڑی بحث کرنے کے بجائے ہمیں ایک اصول پر چلنا چاہئے کہ ہم بے ایمانوں کی اس دنیا میں جس حد تک ایماندار بن کر رہ سکتے ہیں۔ اس حد تک اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ دوسروں پر کیچڑ اُچھالنے سے پہلے ہمیں اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔"

بوڑھی عورت نے ہاتھ نچا کر تیز آواز میں کہا۔ "ارے تُو جوان ہے اس لئے ایسی

بات کر رہا ہے۔ میری طرح دنیا کی ٹھوکریں کھا کر تجربہ حاصل کرے گا تب تیری سمجھ میں آئے گا کہ مجھ جیسی عورت بھی اس طرح چوریاں کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

نوسرباز نے کہا۔ "نوجوان! تم اپنی باتوں سے بہت ایماندار نظر آتے ہو۔ مگر باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم بوڑھوں کے پاس عزت سے زندگی گزارنے کے ذرائع نہیں ہیں۔ تو کیا ہمیں عزت سے روٹی اور کپڑا دے سکتے ہو۔"

"ہاں دے سکتا ہوں۔ تم دونوں مجھے نادان اور تجربے کار نہ سمجھو۔ میں تین بار جیل جا چکا ہوں۔"

"اچھا۔" خوشی سے دونوں کی بتیسی نکل آئی کیونکہ دونوں کے پورے بتیس دانت نہیں تھے۔

"مگر میں اب عزت کی زندگی گزارنے کا عہد کر چکا ہوں۔ اگر یہ عزت کی زندگی تھوڑا سا جھوٹ بول کر حاصل ہو سکتی ہے تو میں اسے ضرور حاصل کروں گا۔ شریفوں کے اُونچے گھرانوں میں کوئی مجھے بیٹا کہہ کر گلے سے لگانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا میں رشتوں کا نوسرباز بن کر پوچھتا ہوں۔ کیا تم میرے باپ بننا پسند کرو گے؟"

"آں۔ ہی ہی۔ کیا تم مذاق کر رہے ہو؟ اس دنیا میں اپنے باپ کے علاوہ صرف ضرورت کے وقت گدھوں کو باپ بنایا جاتا ہے۔ شاید تم مجھے گدھا سمجھ رہے ہو؟"

"نہیں میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ماں باپ بچپن میں ہی مَر گئے تھے۔ میں ان کی کمی پوری کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنا باپ اور اس مائی کو اپنی ماں بنانا چاہتا ہوں۔"

اس کی بات سنتے ہی بوڑھی عورت دونوں بانہیں پھیلا کر جذباتی انداز میں آگے بڑھی۔

"ہائے میرے لال۔ میرے بیٹے! تیری باتیں سن کر میری سوئی ہوئی ممتا جاگ گئی ہے۔ بیٹا میں تجھے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔"

وہ نادر کے سینے سے لگ گئی۔ پھر جیسے اس نے گمشدہ بیٹا پا لیا ہو۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور نادر کے چہرے کو چُوم رہی تھی۔ نادر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ جب تھوڑی دیر بعد اس سے الگ ہوئی تو نادر نے آنسو پُونچھتے ہوئے کہا۔

"ماں جی! وہ سو روپے کا نوٹ واپس کر دو جو تم نے میری جیب سے اُڑایا ہے۔"

نوسرباز نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اری تُو تو بڑی پکی نکلی۔ بیٹا بنا کر بھی جیب کاٹ لی۔''

''میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ماں بنا کر گلا کاٹ لیتے ہیں۔'' ماں جی نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو صرف جیب کاٹی ہے۔ لو بیٹے! اپنا نوٹ واپس لے لو۔ دوسری ماؤں کی زبانیں بیٹا کہنے کے لئے ترستی ہیں۔ میری انگلیاں کسی جیب میں جانے کے لئے بے چینی سے لرزتی ہیں۔''

اس نے سو روپے کا نوٹ آگے بڑھادیا۔ نادر نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

''اسے رکھ لو ماں جی! بیٹے کی کمائی میں ماں باپ کا حق ہوتا ہے۔ اب میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔''

ماں جی کی آنکھوں میں اس بار جو آنسو آئے وہ مگرمچھ کے نہیں تھے۔ وہ ایک ایسی ماں کی طرح رو رہی تھی جسے ایک دیانتدار بیٹا مل گیا ہو۔ نادر نے گٹھری اٹھا کر کہا۔

''اب ہم تھانے جائیں گے۔ تم دونوں مجھ پر بھروسہ کرو۔ جب میں نے تمہیں ماں اور باپ بنایا ہے تو پھر تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

ان دونوں کو مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ماں باپ کا رشتہ بڑا مہنگا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے آج تک کوئی ایسا بیٹا نہیں دیکھا تھا جو ماں باپ کو تھانے لے جاتا ہو۔ نادر نے تھانے پہنچ کر وہاں کے انچارج کو ساری باتیں بتاتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر صاحب بڑی تلاش کے بعد یہ ماں باپ ملے ہیں۔ میں ان دونوں کو شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کروں گا اور یہ دونوں مجبور ہیں۔ ان سے تمام باتیں طے ہوگئی ہیں کہ انہیں دال روٹی ملتی رہے گی تو یہ چوری اور نوسربازی کے پیسے نہیں کھائیں گے۔ میں اسی امید پر انہیں آپ کے پاس لے کر آیا ہوں کہ آپ انہیں حوالات میں بھیجنے کے بجائے میرے ماں باپ بنا کر تھانے سے رخصت کریں گے۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''میں صرف قانون کا محافظ ہوں مجھے اتنا حق حاصل نہیں ہے کہ میں مجرموں کو معاف کرسکوں۔ میں اس سلسلے میں تمہارا حوالہ دے کر ڈی۔ آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ ڈی۔ آئی۔ جی۔ کو فون کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے

نادر کا حوالہ دے کر دو مزید چوروں کی سفارش کی۔ تھوڑی دیر تک وہ باتیں کرتا رہا۔ اور ڈی۔ آئی۔ جی کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ کر کہا۔

''نادر! ڈی۔ آئی۔ جی صاحب نے تمہارے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ اگر ایک سزا یافتہ مجرم پوری ایمانداری سے عزت کی زندگی گزارنے کا عہد کرلے تو وہ اسی طرح قانون کی مدد کرتا ہے جس طرح تم ابھی چوری کا مال برآمد کر کے ہماری مدد کررہے ہو۔ تم جیسوں کے ساتھ اگر پولیس والوں پورے اعتماد سے تعاون کریں تو تم اپنے ساتھ دوسرے بدمعاشوں کو بھی اپنی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کرتے رہو گے۔ معزز اور شریف انسانوں کو ضمانت حاصل کرنے کے بعد کسی ملزم کو رہا کیا جاتا ہے۔ پولیس والوں کے لئے تم بھی ایک معزز انسان ہو۔ ہم تمہاری ضمانت پر ان دونوں کو تمہارے حوالے کررہے ہیں۔''

جب نادر انسپکٹر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگا تو اس کے نئے ماں باپ اسے بڑی حیرانی اور بڑے اعتماد سے دیکھ رہے تھے۔ تھانے سے باہر آکر اس کے باپ نے کہا۔

''بیٹا! پہلے تو میں تمہارا مذاق یا تمہاری مکاری سمجھ رہا تھا مگر اب میں تمہاری ایمانداری پر ایمان لے آیا ہوں۔ اب میں مرتے دم تک تمہارا باپ بن کر ہی رہوں گا۔''

گھر پہنچ کر ان تینوں نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرایا نادر نے پہلے اپنے باپ سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میرا نام گلباز خان ہے۔ میں پٹھان ہوں اور پشاور کا رہنے والا ہوں۔ دس برس پہلے میں ایک ٹرک ڈرائیور بن کر اس شہر میں آیا۔ ملک کے اندر ٹرک کے ذریعے مال لے جانے کا کاروبار ایسا ہے کہ ٹرک ڈرائیور خود بخود اسمگلنگ کے طریقے سیکھ جاتے ہیں۔ ٹرک کے اندر چرس' افیون' وہی وہانوی کی کتابیں اور بلیو فلموں کے کیسٹ اور دیگر غیر قانونی چیزیں دوسرے سامانوں میں چھپا کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اس دھندے کے دوران پولیس والوں نے مجھے تین بار پکڑا۔ تیسری بار میرا لائسنس چھین لیا گیا۔''

یہ کہہ کر گلباز خان نے نادر سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس چرس کا ایک سگریٹ ہو گا؟''

اماں جی نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیوں رے گلباز خان! بیٹے سے چرس کا سگریٹ مانگتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ سگریٹ پینے کے بعد بیٹے سے کہے گا' مجھے کوئی عورت لا کر دے۔“

گلباز خان نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا بہت سمجھ دار ہے۔ میرے کہنے سے پہلے ہی تجھے ماں بنا کر لے آیا ہے۔“

وہ طنطنا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

”اے میں اپنے بیٹے کی ماں تو بن سکتی ہوں۔ تیری جورو نہیں بن سکتی۔ دیکھو نادر اپنے باپ کو اچھی طرح سمجھا کہ یہ مجھے اپنی ماں نہ سمجھے۔ میرا مطلب ہے کہ سچ مچ اپنی گھر والی نہ سمجھے۔“

نادر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”ٹھہرو ٹھہرو۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ یہاں تم دونوں کو شریف والدین کی طرح رہنا چاہیئے۔ اگر میں نے اس عورت کو ماں جی بنایا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس کی مرضی کے خلاف اسے بیوی سمجھو۔ جس طرح شریف گھرانوں میں نوجوان بچوں کی عشق بازی پسند نہیں کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس گھر میں ماں باپ کو عشق کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تم ایمان کی بات کہو اگر تمہارا کوئی بیٹا ہوتا تو کیا تم اس سے چرس کا سگریٹ مانگ کر پینا پسند کرتے؟“

گلباز خان نے شرمندگی سے کہا۔

”بیٹے میں شرمندہ ہوں۔ عادت سے مجبور ہو کر یہ بات زبان سے نکل گئی۔ ویسے تم بھی مجھے دل سے باپ تسلیم نہیں کر رہے ہو۔ کیا اچھے گھرانے کی اولاد اپنے باپ کو تم سے مخاطب کرتی ہے؟“

نادر نے بھی شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”آئندہ میں آپ کو آپ سے مخاطب کروں گا۔ ہم اچھی گفتگو اور اچھے طور طریقوں سے ایک اچھا گھر بنا سکتے ہیں اور دوسروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ کوئی گرے پڑے لوگ نہیں ہیں۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں سچ بول کر یہ گھر نہیں بسا سکتا ہوں۔ جس لڑکی کو میں نے پسند کیا ہے۔ اس لڑکی کے والدین سے بھی یہ جھوٹ کہنا ہو گا کہ آپ دونوں میرے سگے والدین ہیں۔“

ماں جی نے خوش ہو کر کہا۔ ”اے بیٹا! میری ہونے والی بہو کہاں رہتی ہے؟ مجھے لے چلو۔ میں رشتے کی بات کروں گی۔ آج مجھے ایک بیٹا ملا ہے کل ایک چاند سی بہو مل جائے گی۔“

”امی' میں آپ کو اس حلیے میں نہیں لے جاؤں گا۔ پہلے آپ کے لیے اچھی ساڑھیاں لے کر آؤں گا۔ پتہ نہیں آپ نے کتنے دنوں سے غسل نہیں کیا ہے۔ آج آپ اچھی طرح صابن رگڑ رگڑ کر پچھلی زندگی کا میل چھڑائیں۔ پھر میں شام کے وقت وہاں آپ کو لے چلوں گا۔ آج صائمہ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ لوگوں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ بہرحال آپ یہ بتائیں کہ آپ کا......ا.... نام کیا ہے اور کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

”یوں تو مجھے زیبو کہتے ہیں۔ مگر میرا نام زیب النساء ہے۔ میں ایک مہاجر عورت ہوں۔ جب میں پاکستان بننے کے بعد یہاں آئی تو یہاں اپنے مرحوم خاوند کی جائیداد کے تبادلے میں ایک لاکھ روپے ملے۔ مگر میرے بیٹے نے جوان ہو کر وہ دولت مجھ سے ہتھیا لی۔ بہو آئی تو اس نے روٹی کپڑے سے بھی محتاج کر دیا۔ مجھے بھوک لگتی تھی تو میں بہو کی نظریں چرا کر اپنے ہی گھر سے روٹی چرا کر کھاتی تھی۔ بیٹا مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ میں دودھ چرا کر پی لیتی تھی۔ اپنے ہی گھر میں چور بن کر' معلوم ہوا کہ انسان کا پیٹ اسے کیسی کیسی بری عادتیں سکھا دیتا ہے۔ ایک بار اپنے پوتے کے حصے کا دودھ چرا کر پی رہی تھی کہ بہو نے پکڑ لیا۔ بیٹا تمہیں نہیں معلوم جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ بھی بچوں کی طرح اچھی چیزیں کھانے کے لیے للچاتا ہے۔ اس وقت میری عقل بھی اپنے پوتے کے برابر ہو گئی تھی۔ مگر بہو نے وہ طوفان اٹھایا ایسی ایسی چوریوں کے الزامات لگائے کہ میں ہکا بکا سی سوچتی رہ گئی کہ گھر میں ایسی ایسی چوریاں بھی کی جا سکتی ہیں جیسے کہ الزامات لگائے جا رہے ہیں۔“

یہ کہتے وقت وہ کہیں دور خلا میں اپنے بیٹے بہو اور پوتے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو بیکار ہو جاتا ہے اور اپنی اولاد پر بوجھ بن جاتا ہے۔ تو اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو صرف پانی نظر آتے ہیں۔ وہ بھیگے بھیگے لہجے میں بولی۔

”میرے مرحوم شوہر کے اس ایک لاکھ روپے میں میرا بھی حصہ تھا۔ مگر بیٹے کی محبت میں اپنا حصہ بھول گئی تھی۔ اب اسی گھر میں مجھے چور بنایا جا رہا تھا۔ جب کہ میں اپنا

حصہ چرا کر کھا رہی تھی یہ کیسی دنیا ہے بیٹے۔ دوسروں کی روٹی چراؤ تو پیٹ بھر جاتا ہے‘ اپنے حصے کی روٹی چراؤ تو اپنا ہی بیٹا چور کہہ کر منہ پر طمانچہ مارتا ہے۔ میرے بیٹے نے پہلی بار میرے منہ پر طمانچہ مارا۔“

وہ اپنے ایک طرف کے گال پر انگلی رکھ کر بتانے لگی۔

”یہ۔ یہاں مارا تھا۔ تمہیں انگلیوں کے نشانات نظر نہیں آئیں گے مگر بیٹے کی انگلیاں اب بھی یہاں جل رہی ہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے میرے بیٹے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آخری فقرہ اس نے اتنے کرب سے کہا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں اپنے بیٹے کی بے رحم انگلیوں سے بول رہی ہو۔

”اب اگر میں نے تمہاری جیب سے سو روپے نکال لیے تھے تو کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں ہے کہ بیٹے کا طمانچہ کھا کر دوسرے بیٹے کے سو روپے کی چور بن جاؤں۔ میرے لال نے مجھ سے کہا کہ میں صبح ہونے سے پہلے اس کا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔ مجھے تو گھر سے نکلنا ہی تھا۔ چور تو بن ہی گئی تھی۔ لہٰذا زندگی میں پہلی بار میں نے اپنی بہو کے زیورات چوری کیے۔ پھر وہاں سے بھاگ کر اس شہر میں چلی آئی۔“

وہ پلنگ کے ایک سرے پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ نادر اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگا کر بولا۔

”امی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سب ہی بیٹے بے حس اور جورو کے غلام نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بیوی کو سر پر بٹھاتے ہیں مگر ماں کے قدموں کی جنت میں بھی جھکتے ہیں۔ ایک بیٹے نے جہاں طمانچہ مارا ہے۔ دوسرا بیٹا اس جگہ کو عقیدت سے چوم رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی ماں کو چومنے لگا۔ ”امی میں اپنے پیار کو مرہم بنا کر آپ کے زخموں پر رکھتا رہوں گا۔ آپ ایمانداری سے میری امی بن کر رہیں گی نا؟“

”ہاں بیٹا برسوں سے میرا سینہ ماں کے دل سے خالی تھا۔ اب اس سینے میں تمہارا پیار دھڑک رہا ہے۔ تم شادی کرو گے میری بہو آئے گی‘ میرا پوتا ہو گا تو اب میں اپنے پوتے کے حصے کا دودھ چرا کر نہیں پیوں گی۔

جس طرح والدین کی غلط پرورش بچوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح جوان اولاد کا رویہ باپ سے اس کی شفقت اور ماں سے اس کی ممتا چھین کر ان بوڑھوں کو محرومیوں کا

احساس دلاتا ہے اور بہت سے والدین کو میری طرح چور بنا دیتا ہے۔ تم تو بہت اچھے بیٹے ہو۔ میں تمہارے گھر میں چوری نہیں کروں گی۔“

ماں کی طرف سے بھی مطمئن ہونے کے بعد نادر نے پوچھا۔

”اب ہم اپنے خاندان کا شجرہ کیسے بنائیں گے؟“

گلباز خان نے کہا۔ ”باپ کی طرف سے خاندان کا نام آگے بڑھتا ہے۔ میرے باپ دادا قصہ خوانی بازار کے مشہور تاجر تھے۔ اس سے بہت پہلے ہمارے دادا وغیرہ مغل فوج کے سپہ سالار رہ چکے تھے۔ ہمارا خاندان جیالے سپاہیوں کا خاندان ہے۔ تمہاری ماں رشتے کی بات کرنے جائے گی تو بڑے فخر سے اس خاندان کا ذکر کرے گی۔“

جب خاندان کا مسئلہ حل ہو گیا تو نادر نے کہا۔

”اب ایک بھائی اور ایک بہن کی ضرورت ہے۔ میں نے صائمہ کی امی سے کہا ہے کہ میری والدہ میرے بھائی اور بہن کے ساتھ لاہور گئی ہوئی ہیں اور میرے والد صاحب حج کرنے گئے ہوئے ہیں۔“

گلباز خان نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”واہ بیٹا! تم نے تو مجھے حاجی بنا دیا۔ یوں تو میں پانچ برس .... پہلے خانہ کعبہ تک جا کر آچکا ہوں لیکن حج نہیں کیا۔ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی میرے دل پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرے دل نے کہا یہاں حج کرنے والے سبھی شریف لوگ نہیں ہوتے۔ اگر تم بھی بہروپیے بن کر خدا کے سامنے جا سکتے ہو تو آگے بڑھو۔ مگر میں آگے نہ بڑھ سکا۔ میرے پاؤں کانپنے لگے۔ کیونکہ حج کرنے کے بعد اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ اپنے ملک واپس جا کر عزت کی روٹی ملے گی۔ مجھے تو وہی نو سربازی کرنا تھی۔ میں نے دور ہی کھڑے رہ کر عہد کیا تھا کہ اگر مجھے شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا تو ایک بار میں حج کے لیے ضرور آؤں گا۔ آج مجھے ایسی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بات مان کر اور تمہارے کام آ کر مجھے ایک حج کا ثواب حاصل ہو گا۔“

”صرف باتوں ہی سے عزت کی زندگی حاصل نہیں ہو جاتی۔ انہیں اس دنیا کے نام نہاد شریفوں سے باقاعدہ جنگ کرنا تھی........ جب تک عزت سے روٹی اور کپڑا حاصل نہ ہو‘ اس وقت تک یہ دنیا والے اپنے برابر جگہ نہیں دیتے۔ نادر شام تک نئے کپڑے خرید کر لایا اور نئے والدین کا پرانا حلیہ بدل کر انہیں اوپر سے شریف انسان بنا دیا۔ پیٹ بھر کر

روٹی حاصل کرنے کے لیے صرف لانڈری کی آمدنی کافی نہیں تھی۔ لہٰذا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ گلباز خان کے لیے ایک ریڑھا خریدا جائے گا۔ جس پر وہ بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں اور کھلونے رکھ کر کبھی اسکول کے سامنے جائے گا اور کبھی محلے میں پھیری لگائے گا۔ نادر نے کہا۔

”دیکھئے ابا جان! ہم نے بے ایمانی سے آپس میں خون کے رشتے قائم کیے ہیں۔ مگر ایمانداری سے روزی حاصل کرتے رہیں گے۔ اس گھر میں حرام کا ایک پیسہ بھی نہیں آئے گا۔“

وہ باپ کو سمجھانے کے بعد اپنی ماں کو لے کر صائمہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دینے پر صائمہ نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ نادر کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی کیونکہ وعدے کے مطابق اس نے صبح ملاقات نہیں کی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ایک معمر خاتون کو دیکھ کر وہ ایک دم سے شرما گئی فوراً ہی سمجھ گئی کہ اس کی ہونے والی ساس آئی ہے۔ اس نے انہیں اندر آنے کے لیے کہا۔ پھر بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نادر کی امی جو‘ اب زیبو سے زیب النساء بیگم بن گئی تھیں وہ کمرے کی سجاوٹ کو اور قیمتی چیزوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مینٹل پیس کے اوپر ایک ایسی گھڑی رکھی ہوئی تھی جس کے ساتھ ریڈیو اور کلینڈر منسلک تھے۔ زیب النساء نے کہا۔

”بیٹا ایسی انوکھی چیزیں ہمارے ملک میں نہیں ملتیں۔ یہ کتنے میں فروخت ہو سکتی ہے؟“

”کیا؟“ نادر نے اپنی امی کو گھور کر دیکھا۔

”اے بیٹا گھورتے کیوں ہو۔ میں نے چوری چھوڑ دی ہے۔ مگر چیزوں کی قیمت کا اندازہ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو‘ میں بہو کو کچھ دے کر جاؤں گی‘ لے کر نہیں جاؤں گی۔“

نادر نے فوراً اپنی جیب سے پچاس روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے جاتے وقت اسے اپنی بہو کے ہاتھ پر رکھ دیجئے گا۔“

اتنے میں صائمہ کی والدہ آگئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک قیمتی پرس تھا۔ غالباً وہ کہیں باہر جانے والی تھیں۔ نادر نے اپنی امی کا تعارف کرایا تو وہ خوش ہو کر بولیں۔

”آؤ بہن بیٹھو۔ اگر آپ کے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو پھر مجھ سے ملاقات نہ

ہوتی۔ اب میں بعد میں چلی جاؤں گی۔ نادر کہہ رہا تھا کہ آپ لاہور گئی ہوئی تھیں۔“

”جی ہاں آج صبح ہی واپس آئی ہوں۔ میری بیٹی بی۔ اے فائنل کے پرچے دے رہی ہے۔ وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ دو چار دنوں میں آجائے گی۔ آپ کی صائمہ بھی خاصی تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں بہن‘ میں اسے زیادہ نہ پڑھا سکی۔ جب یہ دسویں جماعت میں تھی۔ تبھی میں نے اس کی شادی کر دی۔ نادر نے تو آپ کو اس شادی کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہو گا۔“

”ہاں نادر کی زبانی یہ سب کچھ سن کر بہت افسوس ہوا۔ ایسے نوجوانوں پر ہزار بار لعنت جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ جن کے ماں باپ بھی نہیں ہوتے۔ پتہ نہیں یہ کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں پر بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ ایک نمبر کے لفنگے ہوتے ہیں........“

نادر نے ذرا کھنکار کر اپنی ماں کو احساس دلایا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی نادانستگی میں لفنگا کہہ رہی ہے۔ پھر اس نے ہولے سے اپنی کہنی ماری تاکہ بات بدل جائے۔

”اے بیٹا یہ تم کہنی کیوں مار رہے ہو؟“ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر صائمہ کی والدہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔

”تم یہاں بیٹھے ہماری باتیں کیا سن رہے ہو۔ جاؤ جلدی سے مٹھائی لے کر آؤ میں اپنی بیٹی کا منہ میٹھا کر کے جاؤں گی۔“

نادر ذرا شرماتے اور مسکراتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ جب وہ آدھ گھنٹے بعد مٹھائی لے کر واپس آیا تو صائمہ بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ صائمہ اسے دیکھ کر وہاں سے جانے لگی تو زیب النساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”اے بیٹی کہا جا رہی ہو۔ آج کل شرمانے والی لڑکیاں بے وقوف کہلاتی ہیں۔ چلو میرے ہاتھ سے مٹھائی کھالو۔“

اس نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ایک لڈو نکالا صائمہ شرما کر منہ چھپانے لگی۔ نادر اپنی شرمانے والی محبوبہ کو بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڈو کھانے سے انکار کر رہی تھی۔ مگر اس کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ مگر زیب النساء نے تھوڑا سا کھلا ہی دیا۔ نادر سے نظریں ملیں تو مارے شرم کے اس کے رخسار دمک اُٹھے۔ نادر کے ہونٹوں پر میٹھی

مسکراہٹ تھی اور اس کی خوبصورت آنکھیں محبت اور شہد کے امرت سے لبریز تھیں۔ زیب النساء نے اپنے بلاؤز کے گریبان سے پچاس پچاس کے دو نوٹ نکال کر صائمہ کی مٹھی میں پکڑا دیئے۔ وہ اپنی مٹھی کو بھینچے سرخ چہرے کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر بھاگ گئی۔

واپسی پر زیب النساء نے اسے بتایا کہ شادی کی تاریخ پکی ہوگئی ہے۔ صائمہ کی امی کو زیادہ دھوم دھام پسند نہیں ہے کیونکہ چھ ماہ پہلے صائمہ کے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ اس لیے وہ سادگی سے نکاح پڑھا کر بیٹی کو رخصت کردینا چاہتی ہے اگلے ماہ کے پہلے جمعہ کو نکاح پڑھا دیا جائے گا۔

"مگر امی اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے' ابھی تو ایک بھائی اور ایک بہن کا انتظام نہیں ہوا ہے۔"

"ارے تو کسی کو پکڑ لاؤ۔ یہاں تو سب ہی دعوے کرتے ہیں مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور بیوی کے سوا ہر لڑکی بہن ہوتی ہے۔ اس دعوے کے پیشِ نظر قدم قدم پر بھائی اور بہن مل سکتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے امی مگر ہمارے یہاں مستقل طور سے رہنے کے لیے بھائی بہن نہیں ملیں گے۔"

"شادی ہونے پر عارضی طور پر مل سکتے ہیں۔ ابھی شادی کے لیے پندرہ دن ہیں۔ ہم کہیں نہ کہیں سے ان رشتوں کو بھی حاصل کرلیں گے۔"

انہوں نے گھر پہنچ کر گلباز خان کو بتایا کہ شادی کی تاریخ پکی ہوگئی ہے۔ صرف بھائی بہن کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ اگر شادی کے موقعہ پر سگے بہن بھائی نظر نہ آئے تو لڑکی والوں کے سامنے ان کا جھوٹ کھل جائے گا۔ نادر نے چونک کر اپنی امی کو دیکھا' پھر کہا۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا امی! میں نے صائمہ کے ہاتھ پر رکھنے کے لیے پچاس کا نوٹ دیا تھا۔ مگر آپ نے اپنی ہونے والی بہو کو دو پچاس کے نوٹ دئے ہیں۔ وہ دوسرا پچاس کا نوٹ آپ کے پاس کہاں سے آگیا تھا؟"

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "دیکھو بیٹے پہلی بار دلہن کے ہاتھ پر پچاس رکھتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ اب میں کیا کروں۔ اس کی ماں کا پرس صوفے پر رکھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں کھجلی ہورہی تھی۔ تم نے چوری کرنے سے بھی منع کیا تھا' اس لئے میں نے چوری

نہیں کی ہے۔ اس کی ماں کے روپے نکال کر اس کی بیٹی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ دیکھو۔ دیکھو تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ تم نے کہا تھا اس گھر میں حرام کا ایک پیسہ بھی نہیں آئے گا۔ میں نے پیٹ کے لئے چوری نہیں کی ہے۔ اس خاتون کے پیسے اس کے گھر میں ہی رہیں گے نا۔ تم یہ سوچو میں نے دلہن کو سو روپے دے کر تمہارا مان کس طرح بڑھایا ہے۔"

نادر کے جی میں آیا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"امی اگر آپ پکڑی جاتی تو کیا ہوتا؟"

"مجھے پکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تم نے پہلی ملاقات میں دیکھا نہیں تھا کہ میں پیچھا کرنے والوں کو کس طرح بیوقوف بنا کر نکل گئی تھی۔ تمہاری جیب سے پیسہ نکالتے وقت تم نے پکڑ لیا تھا کہ اپنے ہی لائن کے آدمی ہو۔ میں مانتی ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ چلو اب غصہ تھوک دو۔ آئندہ میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دونگی۔"

نادر ان پر بھروسہ کرنے پر مجبور تھا۔ بھروسہ نہ کرتا تو رفتہ رفتہ راہِ راست پر آنے والے ماں باپ پھر بگڑ جاتے۔ بعض اوقات ماں باپ کو بھی بچوں کی طرح سمجھا بجھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے دن نادر نے گلباز خان کو ایک ہزار روپے دیئے۔ اور اس سے کہا کہیں سے پرانا ریڑھا خرید کر اس پر دکان سجائے۔ گلباز خان نے نوٹوں کو مٹھی میں لے کر کہا۔

"بہت دنوں کے بعد ایک ہزار روپے ایک ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ تم اطمینان' رکھو میں ریڑھا خرید کر پھیری لگاؤں گا۔ اور تمہارے لئے ایک بہن اور اپنے لئے ایک بیٹی تلاش کرتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ زیب النساء بھی دوسرے گھروں میں جھانکنے کے لئے گئی۔ تاکہ کوئی ضرورت مند بیٹی نظر آئے تو اسے اپنا بنا کرلے آئے۔ نادر بھی تمام دن بھٹکتا رہا۔ وہ گھومتا پھرتا شام کو لیاری پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ غریبوں کے علاقے میں شاید کوئی لڑکی اس کی بہن بن جائے گی۔ وہاں اس نے اپنے ایک دوست کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ حیرانی سے بولا۔

"یار تعجب ہے۔ لوگ تو عشق کرنے کے لئے لڑکیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور تم ہو کہ کسی کو معشوقہ بنانے کی بجائے بہن بنانا چاہتے ہو۔ اچھا میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایک غریب بوڑھے کے پاس لے چلتا ہوں۔"

وہ ایک جھگی میں پہنچ گئے۔ جھگی میں ایک سانولی سی لڑکی نظر آئی۔ بوڑھے نے کہا۔

"کیا بات ہے نواز؟ بہت دنوں کے بعد آئے ہو۔"

"رمضانی بابا! یہ میرا دوست ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی کا رشتہ تلاش کروں۔ میرا دوست رشتہ مانگنے آیا ہے۔ مگر اسے بہن بنا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

بوڑھا اسے گھور کر دیکھنے لگا پھر غرا کر کہا۔

"کیا تم مجھے پاگل یا بیوقوف سمجھتے ہو۔ میں نہیں جانتا کہ اس شہر کے بدمعاش کس طرح غریب لڑکیوں کو بہن بنا کر لے جاتے ہیں اور کوٹھے پر بٹھا دیتے ہیں۔"

نادر نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں خدا کو حاضر کر کے کہتا ہوں کہ میں اسے بہن بنا کر رکھوں گا اور ایک سگے بھائی کی طرح اس کی عزت کروں گا۔ میری بہن مجھ پر بھروسہ کرو تم میرے گھر میں ایک بھائی کی غیرت بن کر رہو گی۔"

لڑکی جوان تھی اس جھگی کے اندھیرے میں ایک دولہا کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں کبھی کسی اجنبی بھائی کا خواب نہیں دیکھتیں۔ اسی لیے اس نے نادر کو مایوسی سے دیکھا۔ پھر منہ بنا کر اس سے منہ پھیر لیا۔ نادر چپ چاپ سر جھکا کر جھگی سے باہر آگیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میں بھی کتنا احمق ہوں۔ آج تک کسی ماں باپ نے اپنی بیٹی کو کسی کی بہن بنا کر اپنے گھر سے رخصت نہیں کیا۔ اس دنیا کے دستور کے خلاف خواہ کتنا ہی نیک کام کرو۔ اس میں برائی پڑ جاتی ہے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا ایک بازار سے گزرنے لگا۔ وہاں ایک غریب ریڑھے والا دو بدمعاشوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گھگھیا رہا تھا۔

"بیٹا آج صبح سے بازار مندا ہے۔ آج میں تمہیں پیسے نہیں دے سکوں گا۔"

دونوں بدمعاش مکرانی تھے۔ ان میں سے ایک جوان مکرانی نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔

"سالا پیسہ تمہارا باپ بھی دے گا۔ اپن کو پیسے چاہیے' نہیں تو یہ دکان الٹا دے گا۔"

نادر نے اس کے پیچھے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! یہ بوڑھا بہت کمزور ہے۔ ادھر تمہارا باپ کھڑا ہے مجھ سے غنڈہ ٹیکس وصول کرو۔"

"ابے سالا کیا تم دادا گیری کرنے آیا ہے تیرے کو تو اپن ایک ہی ہاتھ میں سلا دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ گھمایا۔ نادر اچھل کر پیچھے گیا تو اس کا ہاتھ اپنے ہی ساتھی پر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے نادر کا ایک زبردست گھونسہ اس کے منہ پر لگا۔ وہ دوسری طرف الٹ کر ریڑھے پر سے ہوتا ہوا دور جا گرا۔ پھر تو اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ فٹ پاتھ کے دکاندار وہاں سے بھاگنے کے لیے اپنی دکانیں سمیٹنے لگے۔ مکرانی جوان بھی تگڑا تھا۔ وہ بھی نادر کو اپنا ہاتھ دکھا رہا تھا اور نادر سے مار بھی کھا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں لیاری کے غنڈے وہاں پہنچ گئے۔ مکرانی جوان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو یہ بہت تگڑا ہے۔ بڑے مزے کا لڑتا ہے۔ تم لوگ بیچ میں مت آؤ۔ ہم اپنا فیصلہ خود کرے گا۔"

یہ کہتے ہی نوجوان نے نادر کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔ "تو کون ہے رے۔ کدھر سے آیا ہے؟"

نادر نے گھونسہ کھا کر ذرا پیچھے اچھل کر اسے ایک لات مارتے ہوئے بولا۔

"میرا نام نادر ہے۔ میں سزا یافتہ ہوں۔ مگر اب پولیس والوں کے تعاون سے شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں۔ میں کسی کی بدمعاشی نہیں دیکھ سکتا' اس لیے تجھے یہاں سے مار مار کر تھانے لے جاؤں گا۔"

نوجوان نے زمین سے اُٹھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے کیا مسخری کرتا ہے رے۔ ادھر ہم سب تھانے میں بھتہ دیتا ہے۔ ابھی تم سے بھی بھتہ نکالے گا۔"

وہ دونوں پھر اُلجھ پڑے۔ نوجوان نے کہا۔

"سالا تم اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ ادھر ہم دو برس سے دادا گیری کرتا ہے۔ تم ادھر سے زندہ نہیں جائے گا۔"

"اگر میں تمہیں آدھا مردہ بنا دوں اور زندہ نکل جاؤں تو بولو کیا انعام دو گے۔"

"تم جو مانگے گا ہم وہی دے گا۔ تم کو ایک دم سے استاد مان لے گا۔"

نادر نے اس کے سر پر ایک زور کی ٹکر ماری۔ وہ سر تھام کر پیچھے کی طرف گھوما تو اس نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ بازار میں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ مگر سب لوگ دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ دو غنڈوں کو امن و آشتی کا سبق سکھانے کے کسی میں جرأت نہ تھی اور وہ دونوں غنڈے دو پہاڑوں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو سبق سکھا رہے تھے اور مار کھاتے جا رہے تھے۔ آدھ گھنٹے کی مسلسل لڑائی کے بعد نادر کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اب وہ نوجوان بری طرح لڑکھڑا رہا ہے۔ خود کو دونوں پیروں پر کھڑا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ماتحت رہنے والے غنڈے آگے بڑھ کر آئے تو اس نے زخمی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے کہا۔

"پیچھے جاؤ۔ کوئی ادھر نہیں آئے گا۔ ہم بزدل نہیں ہے۔ اس جوان سے جو بات بولا۔ وہ بات پورا کرے گا۔" یہ کہتے ہی وہ زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ پھر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "سالا تم نے سچی مچی ہم کو آدھا مردہ بنا دیا۔ بولو کیا مانگتا ہے؟"

"جو مانگوں گا' وہ ایمانداری سے دے گا!"

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور دے گا۔ اتنا سب آدمی کے سامنے ہم بولتا ہے۔ چلو مانگو۔"

"میں تم سے بھائی کا پیار مانگتا ہوں۔ کیا دے سکو گے؟"

نوجوان ایک دم سے چونک کر دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ بازار کے سارے لوگ بھی نادر کو بڑی حیرانی سے مگر بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ نادر نے کہا۔

"میں عزت سے ایک گھر بسانے کے لیے عزت داروں کی تلاش میں نکلا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے اگر تو میرا بھائی بن جائے گا تو بھائی کی عزت رکھنے کے لیے ضرور عزت دار بن کر رہنے کی کوشش کرے گا۔"

نوجوان نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے کیوں مسخری کرتا ہے۔ تیرے کو نہیں معلوم ہے میرے تیرے جیسا آدمی بدمعاش بن کر رہے گا تو شریف لوگ بھی بہت خوش رہے گا۔ اپن عزت مانگے گا تو یہ لوگ کبھی ہم کو عزت نہیں دے گا۔ اب ہم تیرے کو کیا بتائے گا۔ ماں قسم اتنا بڑا شہر میں عزت مانگتے مانگتے ہم بدمعاش بن گیا۔ اب کیوں ہم کو بھائی بنا کے ہمارا خانہ خراب کرتا ہے۔"

نادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر بولا۔

"عزت مانگنے سے نہیں ملتی۔ ماں باپ اور بھائی بہن کے سائے میں حلال کی روٹی کھانے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ ہم دونوں جوان ہیں۔ کیا ہم خود کنواں کھود کر پانی نہیں پی سکتے ہیں۔"

"جب تو بھائی بن کے بولتا ہے تو ہم ضرور ایسا کرے گا۔ بول۔ اب ہم کو کیا کرنا ہو گا۔"

"تم میرے ساتھ میرے گھر چلو اور اپنے ماں باپ سے ملو۔"

"ارے پھر مسخری کرتا ہے اپنا ماں باپ سے قبر میں جا کر کیسے ملے گا؟"

"اوہو.......... تم سمجھے نہیں' ماں باپ تو میرے بھی نہیں ہیں۔ جس طرح میں نے تمہیں بھائی بنایا ہے۔ اس طرح ایک بوڑھی عورت کو ماں اور بوڑھے مرد کو باپ بنا لیا ہے .... دیکھ بھائی! عزت سے زندگی گزارنے کے لیے پہلے اپنے رشتوں سے محبت اور عزت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بعد پھر دوسروں سے عزت ملتی ہے۔"

"اچھا چلو.......... آج ہم اپنے ماں باپ کو بھی دیکھے گا۔"

وہ دونوں وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں نادر نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"اپن کو سب ادھر میں دادا بولتا ہے۔ مگر ہمارا نام حمید ہے۔ تم ہم کو بتاؤ.......... کہ تم اصل میں کون ہے؟ اور تم دوسرے لوگ کے پھڈے میں کیوں پڑتا ہے۔ کسی کو بھائی بناتا ہے' کسی کو ماں باپ بناتا ہے.......... دیکھو بھائی! صفا صفا بول دو۔ کوئی گھپلا تو نہیں کرے گا۔"

نادر اسے یقین دلانے کے لیے شروع سے آخر تک اپنی داستان سنانے لگا۔ اس نے سمجھایا کہ وہ ایک شریف لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر اپنے گھر لانا چاہتا ہے اور لڑکی والے ایسے تنہا شخص کو رشتہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ اس دنیا میں بعض اوقات سچائی کی خاطر تھوڑا سا جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ جھوٹ بول کر ماں باپ کا رشتہ حاصل کر چکا ہے اور اب اسے بھائی بنا کر لے جا رہا ہے۔ صرف ایک بہن کی کمی رہ گئی ہے۔"

حمید نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”نادر بھائی! تیرا بات سن کر سچی مچی عزت سے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ تو فسٹ کلاس آئیڈیا ہے۔ ہم سب ٹھوکر کھانے والا لوگ آپس میں مل جل کے عزت مانگے گا تو سالا عزت والا لوگ انکار نہیں کر سکے گا۔ آؤ.........اس ہوٹل میں چلو......... ہم ایک کپ چائے پینے کے بعد سوچے گا کہ ہم کو کدھر سے ایک اچھا سا بہن مل سکتا ہے۔“

وہ دونوں کو ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ چائے پینے کے دوران حمید اسے بتا رہا کہ حالات نے اسے کس طرح بدمعاش بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے غنڈہ بن کر پیدا نہیں ہوتا۔ جب روٹی نہیں ملتی تو بے ایمانی کرتا ہے۔ عزت نہیں ملتی ہے تو دادا گیری کر کے دوسروں سے خود کو برتر سمجھنے لگتا ہے عزت نہ ملے مگر برتری تو حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

چائے پینے کے بعد وہ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے نیپئر روڈ پر پہنچ گئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ کوٹھوں پر سے طبلے اور گھنگھرؤں کی آوازیں گونجتی ہوئی باہر آ رہی تھیں.........نادر نے کہا۔

”یہاں سے جلد نکل چلو۔ کیونکہ اس طرف عزت دار لوگ کبھی نہیں آتے۔“

”ارے تو کیا بولتا ہے‘ نادر بھائی! ادھر تو سب سے زیادہ عزت دار لوگ آتے ہیں۔ ہم تمہارا بات مان کر تمہارے ساتھ چلتا ہے۔ تم ہمارا بات مان کے ہمارے ساتھ اس کوٹھے پر چلو۔ ماں قسم ہم تم کو بے عزت نہیں کرے گا۔“

وہ نادر کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے کھینچتا ہوا ایک کوٹھے پر لے گیا۔ وہاں مختلف کمروں میں مختلف طوائفیں مجرا کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں‘ جو گاہکوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ حمید‘ نادر کو جس کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک بوڑھی نائکہ سازندوں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ مسکرا کر استقبال کے لیے اٹھی۔ اسی وقت ایک خوبصورت سی نوجوان لڑکی دوسرے کمرے سے نکل کر آئی۔ نائکہ نے کہا۔

”بیٹی! پاؤں میں گھنگھرو باندھو۔ قدر دان آئے ہیں۔“

حمید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”نہیں......... گھنگھرو نہیں باندھے گا۔ دیکھ بڑھیا۔ تو ہم کو ایک دن بولا تھا کہ اپنی بیٹی کو اس جہنم سے نکالنا چاہتا ہے۔ کوئی دولت مند گاہک ملنے سے بیٹی کا شادی کر دے گا۔ ہم دولت مند تو نہیں‘ ایک عزت دار کو لے کر آیا ہے۔ ہم

دونوں بھائی ہے اور تیرا بیٹی کو اپنا بہن بنا کر لے جانا مانگتا ہے۔“

نادر نے چونک کر حمید کو دیکھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی طوائف زادی کو اپنی بہن بنائے گا۔ بڑھیا نے ذرا ناگواری سے کہا۔

”کیوں رے حمید! ہمارے دھندے کے وقت کیوں فضول باتیں کرنے آیا ہے۔ جا اپنا راستہ لے اور ہمیں اپنا کام کرنے دے۔“

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ماں جی! تُو نے بھی اپنی جوانی اس کوٹھے پر برباد کی ہے‘ کیا تُو نے کبھی ایسے گاہک دیکھے ہیں جو یہاں جوان عورت کو بہن بنانے آتے ہوں۔“

نائکہ کے جواب دینے سے پہلے ہی نادر نے کہا۔ ”ہاں! یہ بالکل عجیب اور انوکھی سی بات ہے۔ یہاں قدم رکھتے وقت میں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا۔ مگر اب سوچ رہا ہوں کہ تم میری بہت اچھی اور پیاری سی بہن بن سکتی ہو۔ کیا تمہارے دل اور دماغ کے کسی گوشے میں کبھی عزت کی زندگی گزارنے کی تمنا پیدا نہیں ہوتی ہے؟“

نادر کی سنجیدگی اور اس کے لہجے کی صداقت نے لڑکی کو ایک دم سے خاموش کر دیا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے دیکھنے کے دوران دل و دماغ کی آنکھوں سے دوسری طوائفوں کی زندگی پر غور کرنے لگی......... کیا ملتا ہے انہیں؟ جوانی میں وقتی قدر دان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہی قدر دان انہیں بڑھاپے کے اگالدان میں تھوک دیتے ہیں۔

اس لڑکی نے اور اس کی نائکہ ماں نے بارہا اس مسئلہ پر غور کیا تھا۔ ایک بار حمید کے سامنے بھی ذکر کیا تھا کہ کوئی دولت مند عزت سے بیاہ کر لے جائے تو اس کی بیٹی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ پیشہ چھوڑ دے گی۔ مگر وہاں دولت نہیں مل رہی تھی۔ صرف بہن بنا کر عزت دینے والے دو بھائی آئے تھے۔ نائکہ نے کہا۔

”میں نہیں مانتی کہ تمہارے جیسا بدمعاش میری بیٹی کو بہن بنا کر عزت دے سکے گا‘ اور یہ جو دوسرا تمہارے ساتھ آیا ہے پتہ نہیں یہ بھی کون ہے۔ اس کی نیت کو میں کیسے سمجھ سکتی ہوں؟“

نادر نے کہا۔ ”میں پولیس کے بڑے بڑے افسروں کی ضمانت پیش کر سکتا ہوں۔ اگر تمہیں قانون کا تحفظ حاصل ہو جائے‘ تو کیا تم میری بہن کو میرے گھر میں عزت سے رہنے کی اجازت دے دو گی؟“

نائکہ نے کہا۔ ”پولیس والے بدمعاشوں کے ساتھ مل کر گھپلا کرتے ہیں۔ اگر وہی

ایماندار رہیں تو اس شہر میں اتنی بدمعاشی نہ ہو۔"

"تمام پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میرے علاقے کا تھانیدار' سینٹرل جیل کا جیلر اور ڈی آئی جی صاحب تمہاری بیٹی کی حفاظت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ اتنے بڑے افسروں سے بے ایمانی کی توقع نہ کرو۔ میں تمہیں ان کے پاس لے چلوں گا۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد تمہیں میری سچائی کا یقین آجائے گا۔"

لڑکی نے نائکہ کے قریب آکر کہا۔ "ماں جی! جب ایک شریف آدمی اتنے بڑے لوگوں کے نام لے رہا ہے تو اس پر بھروسہ کر کے کل اس کے ساتھ چلی جاؤ اور پولیس کے بڑے آفیسر سے خود ہی بات کر لو۔ میں دل میں دعائیں مانگ رہی تھی شاید اب میری دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔"

نادر اپنی بہن بننے والی لڑکی کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ انسان صدقِ دل سے کوشش کرتا ہے تو کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ گودڑی سے لعل اور کیچڑ سے کنول حاصل ہو جاتے ہیں۔ کوئی غلاظت سے پاکیزگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ مگر کامیاب کوششیں بتاتی ہیں کہ پاکیزگی وہاں بھی پائی جاتی ہے۔ عام حالات میں یہ باتیں قصہ کہانیاں کہلاتی ہیں۔ مگر قصے اور کہانیاں بھی ہمارے معاشرے کے چلتے پھرتے کرداروں سے مکمل ہو جاتی ہیں۔

اس رات نادر کے ماں باپ کو ایک اور مکرانی بیٹا مل گیا۔ دوسرے دن ایک بیٹی کے ملنے کی توقع تھی۔ نادر نائکہ کو لے کر ڈی آئی جی کے دفتر گیا تھا اور وہ سب لوگ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ گلباز خان نے حمید سے پوچھا۔

"بیٹے! تم لڑکی کو کب سے جانتے ہو۔ اس کا نام کیا ہے؟ اور کہاں کی رہنے والی ہے؟"

حمید نے جواب دیا۔ "اس کا نام ریشماں ہے۔ وہ پنجاب سے یہاں آئی ہے۔ شاید ہمارا نادر بھائی بھی پنجاب کا ہی رہنے والا ہے۔"

گلباز خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک انوکھا خاندان بنا رہے ہیں۔ تم مکرانی ہو۔ میں پٹھان ہوں۔ تمہاری ماں مہاجر ہے اور نادر اور ریشماں پنجابی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی گھر میں اتنے صوبوں کے لوگ متحد نہیں ہیں۔ حالانکہ پاکستان جیسے چھوٹے سے گھر میں سب ہی رہتے ہیں مگر ایک دوسرے سے الگ......... اجنبی بن کر........."

زیب النساء نے کہا۔ "مگر کوئی ہمارے اس انوکھے خاندان کو تسلیم نہیں کرے گا۔ سب ہی پوچھیں گے کہ ماں مہاجر' باپ پٹھان اور بیٹا بیٹی پنجابی کیسے ہو گئے۔"

گلباز خان نے کہا۔ "ایسا سوال کوئی احمق ہی کرے گا۔ پاکستان بننے کے بعد حالات نے ہمیں ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی طرف بھٹکا دیا ہے۔ ہم کبھی اس تہذیب سے ملتے رہے۔ کبھی اس تہذیب میں گھلتے رہے۔ میں پٹھان ہو کر اردو اور پنجابی بول سکتا ہوں۔ تم اردو بولنے والی ماں ہو۔ اور ایک ماں اپنے بطن سے کتنی ہی زبانیں بولنے والی اولادیں پیدا کر سکتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ اپن سالا کوئی زبان ٹھیک سے نہیں بول سکتا ہے۔"

گلباز خان نے کہا۔ "بیٹے! یہ بات بات میں صرف سالا بولنا چھوڑ دو۔ تمہاری زبان بھی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ شریف لوگ گالی کو تکیہ کلام نہیں بناتے۔ ہم تمہیں اچھی طرح بولنا سکھائیں گے۔"

نادر کی تقدیر مہربان تھی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ دوپہر کو ریشماں بہن بن کر آئی تو ایک چھوٹا سا خاندان تقریباً مکمل ہو گیا۔ صرف ایک بیوی کی کمی رہ گئی۔ اسی کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ محلے والے حیرانی سے اس گھر کی طرف دیکھتے تھے' جہاں پہلے ویرانی تھی۔ وہاں ہمیشہ ہنسنے بولنے والوں کی جنت آباد ہو گئی تھی۔ نادر کی شادی کے لیے بڑے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زیب النساء اور ریشماں محلے کے گھروں میں جا کر راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بعض پڑوسی اور محلے والے کسی کو ہنستا بستا نہیں دیکھ سکتے۔ پہلے تو وہ اس نئے خاندان سے کتراتے رہے۔ پھر تجسس بڑھنے لگا تو ان کی عورتیں اس ٹوہ میں نادر کے ہاں آنے لگیں کہ دیکھیں وہاں رشتوں کی کھچڑی کیسے پک رہی ہے۔

شادی تو نادر کے ہاں ہونے والی تھی۔ مگر رت جگا سارے محلے میں تھا۔ کسی کو نیند نہیں آتی تھی۔ رات گئے تک مردوں کی الگ بیٹھک ہوتی تھی۔ عورتوں کی محفل الگ جمتی تھی۔ کوئی کہتا۔ "نادر نے جب یہاں اپنا مکان بنوایا تھا۔ اس وقت اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ وہ تو یہی کہتا تھا۔ اب ماں باپ کو کس طرح قبر سے اٹھا کر لے آیا ہے؟"

"بھائی بہن بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی ہے۔ رنگ بھی الگ ہیں۔ بولیاں بھی مختلف ہیں۔ اچھا خاصا چڑیا گھر لگتا

ہے۔"

"سالا بدمعاش ہے۔ اپنے گھر میں بدمعاشوں کو جمع کر رہا ہے اور اب کسی معزز گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کر لا رہا ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "نادر کی ماں کہہ رہی تھی کہ کسی سیّد گھرانے میں رشتہ ہو رہا ہے۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "تعجب ہے۔ سیدوں کی بیٹیاں دوسرے گھرانوں میں بیاہی نہیں جاتی ہیں۔ پھر یہ رشتہ کیسے ہو رہا ہے۔ جبکہ نادر کا باپ پٹھان ہے؟"

"جہاں بے ایمان ہوتے ہیں' وہاں ایماندار بھی پائے جاتے ہیں۔" ایک ایمان والے نے کہا۔ "یہ تو بڑی خوشی کا مقام ہے کہ سید اور پٹھان' رشتوں میں گھل مل رہے ہیں۔ خاندانی شان و شوکت دیرپا نہیں ہوتی۔ اور سچے گھرانوں میں بھی سلیقے سے چوری بدمعاشی کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی لڑکیاں بھی بوائے فرینڈز بناتی پھرتی ہیں۔ اگر کوئی سید گھرانہ نادر کو گلے لگا رہا ہے تو یہ سیدوں کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ جب کہ نادر عزت کی زندگی گزارنا چاہتا ہے اور ایسے میں ہم اسے اپنی سطح سے گرانے بیٹھ جائیں تو یہ ہماری کم ظرفی ہو گی۔"

نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ سچی اور کھری باتیں کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لیے جھوٹ کے شور میں ان کی آواز دب جاتی ہے۔ نادر سمجھتا تھا کہ محلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صرف اس کی ذات گفتگو کا موضوع بنی رہتی ہے اور یہ بڑی خوش آئند باتیں تھیں۔ نیا شوہر ہو' نیا گھر ہو' نئی حکومت ہو۔ لوگ ہر نئی چیز کو قبول کرنے سے پہلے ناک بھنویں چڑھاتے ہیں۔ اس پر تنقید کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اسے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ خواہ جبراً ہی قبول کریں۔ ایک بار ریشماں نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"بھائی جان! ہم اس محلے میں کیسے رہیں گے۔ یہاں تو سب ہی ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔"

نادر نے جواب دیا۔ "ریشماں! تم کسی بھی محلے میں جاؤ گی تو رفتہ رفتہ تمہیں معلوم ہو گا کہ ہر جگہ ایک گھر والے دوسرے گھر والوں کے خلاف کچھ نہ کچھ بولتے ہی رہتے ہیں۔ منہ کے سامنے میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ پھر اپنے گھر آکر موازنہ کرتے ہیں کہ اونہہ!

تین ہزار کا ٹی وی رکھ کر اترا رہے ہیں۔ ہمارے پاس تو نو ہزار کا کلر ٹی وی ہے۔"

ریشماں نے کہا۔ "ہاں بھائی جان! ایسی باتیں تو میں سنتی رہتی ہوں۔ وہ جو ہمارے محلے میں خان صاحب رہتے ہیں' ان کی لڑکی' مرزا صاحب کی لڑکی میں کیڑے نکالتی رہتی ہے.......... اور مرزا صاحب کی لڑکی' خاں صاحب کی لڑکی کی برائیاں کرتی رہتی ہے مگر جب دونوں کا سامنا ہوتا ہے تو فوراً ہی گلے لگ جاتی ہیں۔ آپس میں بڑی محبت سے باتیں کرتی ہیں اور باتوں ہی باتوں میں محلے کی دوسری لڑکیوں کے عیب نکالتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں منہ کے سامنے کچھ ہوتا ہے اور پیٹھ کے پیچھے کچھ اور ہو جاتا ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے؟"

"ہمیں اسی دنیا میں اپنا گھر اور عزت بنانا ہے۔ اور ہماری عزت بن رہی ہے۔ دنیا کے دستور کے مطابق پیٹھ پیچھے ہماری برائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر منہ کے سامنے اب یہ لوگ عزت سے مل رہے ہیں۔ یہ ایسی ہی دنیا ہے میری بہن!"

☆======☆======☆

عزت کے سفر میں پندرہ دن گزر گئے۔ نادر جب دولہا بن کر گھر سے نکلا تو محلے کے کتنے ہی لوگ بارات میں شریک ہو گئے۔ سب اسی سید گھرانے کی جستجو میں گئے' جہاں سے ایک دلہن گلباز خان پٹھان کے گھر میں بہو بن کر آنے والی تھی وہاں بڑی سادگی سے نکاح پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جب تک شادی بیاہ کی رسوم ادا ہوتی ہیں۔ اس وقت تک نادر کے شریف باراتی صائمہ کے محلے والوں سے معلومات حاصل کرتے رہے۔ انہیں یہ معلوم کر کے مایوسی ہوئی کہ صائمہ کے والد مرحوم واقعی لکھنؤ کے ایک نامور سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تمام محلہ یہ گواہی دے رہا تھا کہ صائمہ عزت دار باپ کی بیٹی ہے۔

نادر اس روز صائمہ کو پا کر ساری دنیا کو بھول گیا۔ سہاگ کا کمرہ دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دلہن کو سیدھا اسی کمرے میں لے جائے گا۔ مگر اس کمرے میں پہنچ کر کچھ رسومات باقی تھیں۔ اس کے بھائی بہن اور محلے کی دوسری عورتیں باری باری گھونگھٹ اٹھا کر نئی نویلی دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔ دستور کے مطابق منہ کے سامنے تعریفیں کر رہی تھیں۔ اور منہ پھیرتے ہی "اونہہ" کہہ کر کوئی نہ کوئی عیب نکال رہی تھیں۔ نادر اپنے مکان کے بیرونی دروازے پر ایک تختی لگا رہا تھا۔ جس پر جلی حروف سے "پاک منزل" لکھا ہوا تھا۔ اب اس کا ایک گھر مکمل ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی اولادوں سے یہ گھرانہ پھلنے پھولنے والا تھا۔ انسان کی آنکھوں میں کتنے خواب ہوتے

ہیں۔ کچھ خواب شرمندہ تعبیر ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں' جنہیں باہر والے پتھر مار کر توڑ دیتے ہیں۔

کسی نے پتھر مارا تھا۔ وہ پتھر "پاک منزل" کی تختی پر آکر لگا نادر نے پلٹ کر دیکھا تو کسی دوسرے علاقے کے غنڈے اپنے ہاتھوں میں چاقو اور ڈنڈے لیے کھڑے تھے۔ ایک غنڈے نے کہا۔

"یہاں جو حمید رہتا ہے۔ وہ سالا لیاری کا بدمعاش ہے۔ تمہارا بھائی کیسے بن گیا؟"

نادر نے جواب دیا۔ "اگر پتھر نہ مارو تو تم بھی بھائی بن سکتے ہو۔"

"باتیں نہ بناؤ۔" دوسرے غنڈے نے کہا۔ "ہم ریشماں کو جانتے ہیں۔ وہ ایک طوائف ہے۔"

حمید ایک لمبا سا چھرا لے کر نکل آیا۔ پھر گرجتے ہوئے بولا۔

"کوئی سالا میرا بہن کو بدنام کرے گا تو ابھی ہم اس کی لاش گرا دے گا۔"

نادر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "حمید! چھرا پھینک دو۔ ہم جھگڑا نہیں کریں گے۔ اس بات کو سمجھو کہ باہر والے غیرت مند بن کر ہم پر کیچڑ اچھالنے آئے ہیں اور محلے والے بے غیرت بن کر تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ بزدل ہیں۔ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اس لیے پاک منزل کو تباہ کرنے والی بیرونی امداد حاصل کی ہے۔"

محلے کے ایک شریف آدمی نے کہا۔ "نادر ٹھیک کہتا ہے۔ یہ غنڈے کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں۔"

"کہیں سے بھی آئے ہوں۔" دوسرے نے کہا۔ "بدمعاشوں کے پاس بدمعاش ہی آتے ہیں۔ ہمیں ان کے درمیان نہیں بولنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں بولنا چاہیے؟" اس شریف آدمی نے حمایت کی۔ "یہ محلے کی عزت کا سوال ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کو نادر سے شکایت ہے تو ہم آپس کی پنچایت سے شکایتیں دور کر سکتے ہیں۔"

اس کی معقول بات سن کر ایک غنڈے نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔

حمید نے اس غنڈے پر اچانک ہی چھلانگ لگائی۔ پھر اسے رگیدتا ہوا دور لے گیا۔ دوسرے اس پر حملہ کرنے لگے تو مجبوراً نادر کو بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ محلے کے

لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ عورتیں کھڑکیاں کھول کر تماشہ دیکھنے لگیں۔ حمید کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ غنڈے اس کے قریب آنے سے کترا رہے تھے۔ نادر تنہا تھا۔ وہ حملہ آوروں کو مار بھی رہا تھا اور اپنے لہو کے چھینٹے اچھال کر چیخ رہا تھا۔

"چلے جاؤ یہاں سے.......... یہ میرا گھر ہے۔ میں آخری سانس تک اس کی حفاظت کے لیے لڑتا رہوں گا۔ لوگو! تمہیں یہ شکایت کیوں ہے کہ ہمارا ماضی گھناؤنا ہے۔ تم ہمارے "حال" کو دیکھو کہ یہ عزت کی زندگی کے لیے کس طرح تمہارے ہاتھوں لہو میں ڈوب رہا ہے۔"

اس نے ایک بدمعاش کو گھونسہ مار کر پیچھے ہٹایا تو دوسرے بدمعاش نے پیچھے آکر اس کے سر پر ڈنڈے سے ضرب لگائی وہ چکرا کر پاک منزل کے دروازے پر گر پڑا۔ حمید نے فوراً ہی وہاں پہنچ کر اس کے بازو میں چھرا گھونپ دیا۔ پھر دوسرے کی طرف لپکا۔ وہ بدمعاش پلٹ کر بھاگا تو دوسرے بھی بھاگنے لگے۔ گلباز خان ہاتھ میں ڈنڈا لیے انہیں گلی کے آخری سرے تک بھگاتا چلا گیا۔ تینوں باپ بیٹوں نے بڑی جی داری سے مقابلہ کر کے میدان صاف کر دیا تھا۔ اب صرف محلے والے رہ گئے تھے۔ نادر نے اپنی دہلیز کا سہارا لے کر کہا۔

"میرا گھر میرے وطن کا ایک مثالی گھر ہے۔ تمہارے دلوں میں بیک وقت پٹھان' پنجابی' مہاجر اور سندھی کے لیے جگہ نہیں ہے' مگر میرے گھر میں گنجائش ہے۔ اگر تمہیں اپنے ملک سے نفرت ہے تو آؤ' مجھ پر اور میرے گھر پر تھوک دو.........."

سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے' کھلم کھلا کوئی پاک منزل پر پتھر مار سکتا تھا' نہ اسے آگ لگا سکتا تھا۔ کیونکہ آگ تو ایسی لگائی جاتی ہے' جو دکھائی نہیں دیتی اور گھر چپکے چپکے جلتا چلا جاتا ہے۔ (اور جلتا جا رہا ہے۔)

دلہن گھونگھٹ پھینک کر دہلیز پر آگئی تھی اور اپنی عزت کے ہمسفر کو سہارا دے رہی تھی۔ شریکِ سفر کا لہو دلہن کے سرخ جوڑے میں ہم رنگ ہو کر جذب ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

شکستہ صلیب

اس کنواری ماں کا وجود چھلنی ہو رہا تھا۔

اسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کرسمس نائٹ ہے۔

کنواری مریم نے مسیح کو جنم دیا ہے۔

اور تہذیب کی ٹوٹی ہوئی صلیب سے ایک کالے مسلمان کا لہو ٹپک رہا ہے۔

فیری بوٹ لہر لہر تیرتی ہوئی ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بوٹ کی ریلنگ کو تھامے، آگے کی طرف جھکی ہوئی، پانی کی تہہ میں ڈوبے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کسی گہرائی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ آسمان کا غرور جس طرح پانی کی پستی میں ڈوبتا نظر آتا ہے، اسی طرح عورت کا غرور پانی ہو کر اس کی ذات کے اندر کسی گہری پستی میں لڑھکتا جاتا ہے، جسے وہ دنیا والوں سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔

وہ خود کو چھپانے کے لیے پھر ایک بار اپنی شال کو اپنے اطراف لپیٹنے لگی، حالانکہ شال پہلے ہی اچھی طرح اسے چھپائے ہوئے تھی مگر دل میں بے چینی تھی کہ وہ چھپنے کے باوجود ننگی ہو رہی ہے۔ بار بار یہ اندیشہ گھر کرتا تھا کہ آس پاس سے گزرنے والے اس کے اندر جھانک رہے ہیں، اسی لیے وہ ہر بار اپنی شال کو سنبھالنے لگتی تھی۔

اس کے بدن پر اورنج رنگ کا بلاؤز اور اسکرٹ تھا۔ اسی رنگ کی شال اس کے شانوں سے ہوتی ہوئی کمر کے نیچے تک جھول رہی تھی۔ سینے کے اوپر اس نے شال کے دونوں سروں کو یوں تھام رکھا تھا کہ اس کے بدن کی تمام چیختی ہوئی خوبیاں چاروں طرف سے چھپ گئی تھیں، صرف گردن سے اوپر مکھن جیسا ملائم چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جلد کی سرخ و سفید رنگت کے مطابق پیروں میں موزے پہنے ہوئے تھے۔ یہ موزے پاؤں کے تلووں سے شروع ہوئے تھے اور اسکرٹ کے اندر کہیں جا کر چھپ گئے تھے۔ ہائی ہیل کے جوتے اس کے درمیانے قد کو ذرا بلند کر رہے تھے۔ وہی ایک تنہا لڑکی تھی جو فیری بوٹ میں نظر آ رہی تھی ورنہ بوٹ کے وسیع احاطے میں کچھ مرد تھے۔ ایک ٹرک، دو ویگنیں اور چار کاریں تھیں۔ ان کے مالک بار بار اس لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر نظر سوالی تھی کہ وہ کون ہے؟ اور اس سرد علاقے میں تنہا کہاں جا رہی ہے؟ ان کے دیکھنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جلتے ہوئے اورنج رنگ کے لباس میں وہ انگارے کی طرح

دہکتی ہوئی نظر آرہی تھی اور سردی میں نگاہوں کو گرما رہی تھی۔

وہ اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی تھی اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ وہاں ہڈیوں میں اترنے والی سردی تھی‘ اس لیے یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ ٹھٹھر رہی ہے اور بار بار شال کو مضبوطی سے لپیٹ کر گرمی محسوس کر رہی ہے۔ وہ دوسروں سے بے خبر سر جھکائے‘ ریلنگ کا سہارا لیے دریا کی صاف و شفاف لہروں میں جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی ٹوٹی ہوئی ہے مگر اس کا وجود پانی کی لہروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ چہرہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا تھا لہروں میں اِدھر سے اُدھر منتشر ہونے لگتا تھا۔ اسی وقت ایک دوسرا چہرہ اس کے قریب ہی منتشر ہونے لگا۔ لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا گھوم کر دائیں طرف دیکھا۔ اس کے قریب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک عمدہ گرم سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر گزری ہوئی عمر کی سختیاں تھیں۔ تاریک شیشوں کی عینک نے اس کی آنکھوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

”مجھے گریڈی کہتے ہیں۔ تم تنہا نظر آرہی ہو۔ اگر کہیں دور جانا ہو تو میرے پاس کار موجود ہے۔“

وہ گریڈی سے ذرا پرے ہٹتی ہوئی بولی۔

”نہیں شکریہ‘ میں پیدل چلی جاؤں گی۔“

”پیدل کیسے جاؤ گی؟ راستے برف سے ڈھکے ہوئے ہیں اور ساحل کے قریب جو بستی ہے‘ وہ چار فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔“

وہ پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ اس علاقے میں پہلی بار آئی تھی۔ اسے راستوں کا علم نہیں تھا۔ وہ اجنبی کی بات کا فوراً ہی کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسی وقت فیری بوٹ ساحل پر پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گاڑیوں والے اپنی اپنی گاڑیوں کے ہارن بجانے لگے اور دوسری گاڑیوں سے راستہ طلب کرنے لگے۔ گریڈی نے کہا۔

”تمہارے جتنی بڑی میری بھی ایک لڑکی ہے‘ اسی لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری کار میں بیٹھ کر آسانی سے اپنی منزل تک پہنچ جاؤ۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو فوراً آگے بڑھو پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیاں ہارن دے رہی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی کو عجلت میں سوچنے کا موقع نہ ملا۔ وہ فوراً ہی اپنی چھوٹی سے اٹیچی اٹھا کر کار کی دوسری جانب چلی گئی۔ گریڈی نے اس کے لیے

دروازہ کھول دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی‘ ہچکولے کھاتی ہوئی‘ فیری بوٹ سے نکلتی ہوئی‘ ساحلی سڑک پر آگئی۔ سڑک کے دونوں جانب برف کی پہاڑیاں سی کھڑی تھیں۔ نیگرو نوجوان اور بوڑھے ہاتھوں میں بیلچے لیے راستے پر سے برف ہٹا رہے تھے۔ ان سیاہ فام مزدوروں کو دیکھ کر لڑکی نے نفرت سے منہ بنا لیا۔ گریڈی نے کہا۔

”یہ کالے لوگ زمین کا پھوڑا ہیں۔“

لڑکی نے ناگواری سے کہا۔

”پتہ نہیں یہ لوگ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اگر پیدا بھی ہوتے ہیں تو زندہ کیوں رہتے ہیں؟ ان کی زندگی میں کہیں بھی تو حسن نہیں ہے۔ کالا کالا چہرہ‘ مفلسی اور فاقہ کشی کی کالی کالی زندگی‘ ان کے سارے جذبات بھی کالے ہوتے ہوں گے۔ اس پر یہ لوگ اپنے حقوق کا مطالبہ ایسے کرتے ہیں جیسے امریکہ ان کے باپ کا ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس سرزمین پر یہ غلام بن کر آئے تھے اور اب بھی محض غلام بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔“

گریڈی نے کہا۔ ”لعنت ہے ان پر‘ ان کالوں کے متعلق باتیں کرتے وقت بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اطراف سیاہی پھیل رہی ہو۔ ہمیں اپنی باتیں کرنی چاہئیں‘ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرلن!“

”میرلن تم بہت کم عمر ہو‘ تنہا کہاں جا رہی ہو؟“

یہ کہتے ہوئے اس نے میرلن کے پیچھے ایک ہاتھ بڑھا کر سیٹ کی پشت پر رکھ دیا پھر اس کی تعریف کی۔

”تم بے حد حسین ہو اور دلیر بھی ہو۔“

وہ سمٹ کر دروازے کی طرف چلی گئی اور سہم کر بولی۔

”میری عمر کی تمہاری بھی ایک بیٹی ہے۔“

”ہاں! تم میری بیٹی کی ہم عمر ہو مگر بیٹی تو نہیں۔“

میرلن نے فوراً کھڑکی کے پار دور دور تک پھیلے ہوئے مکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس یہیں روک دو‘ میری آنٹی وہیں کسی مکان میں رہتی ہیں۔“

گاڑی کی رفتار میں کمی نہیں ہوئی۔ گریڈی نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنٹی وہاں نہیں رہتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میرلن نے غصے سے پوچھا۔ "کیا تم مجھ سے زیادہ میری آنٹی کو جانتے ہو؟"

"میں تمہاری آنٹی کو نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ یہاں آس پاس جتنے مکانات ہیں' یہ سب سمر ہاؤس ہیں۔ ان کے مالکان گرمیوں کا موسم گزارنے کے لیے یہاں آتے ہیں پھر سردی کے موسم میں اپنے مکانوں کو لاک کر کے چلے جاتے ہیں۔"

میرلن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کا جھوٹ کھل رہا تھا مگر وہ جھوٹ ہی کیا جسے نبھایا نہ جا سکے' وہ فوراً ہی ایک اسٹور کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"وہ دیکھو' اس اسٹور کے پاس روک دو۔ آنٹی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس اسٹور کے پاس میرا انتظار کریں گی۔"

"مگر مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولی۔

"تم اندھے ہو۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ میں کہیں بھی جاؤں تم مجھ پر تنقید کرنے والے کون ہو؟ گاڑی روک دو۔"

گریڈی کو مجبوراً گاڑی روکنی پڑی کیونکہ اسٹور کے قریب ہی ایک پولیس کار آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اگر وہ گاڑی نہ روکتا اور میرلن چیختی رہتی تو پولیس والے اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ اس نے اسٹور کے سامنے گاڑی روک دی۔ میرلن اپنی شال کو سنبھالتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے اٹیچی اٹھا کر کار سے باہر جانے لگی۔ گریڈی نے دروازے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"تم جوان ہو اور تنہا ہو اپنی حفاظت نہیں کر سکو گی۔ بہتر ہے کہ میرا سہارا قبول کر لو۔"

میرلن کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور کے دروازے پر پہنچی اور اسے کھول کر اندر چلی گئی۔ کار والا مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔

اسٹور میں نیم تاریکی تھی۔ میرلن نے مدھم سی روشنی میں اسٹور کیپر کو دیکھا۔ وہ تین چار بوتلوں کے بچے ہوئے فروٹ جوس نکال کر ان کی ایک نئی بوتل بنا رہا تھا۔ وہ اپنا کام اتنی صفائی سے کر رہا تھا کہ میرلن حیرانی سے تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ شاید

اسٹور کیپر کو ہوش نہیں تھا کہ ایک لڑکی اس کی دکان میں آ کر اس کے کاروباری ہتھکنڈوں کو خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔ میرلن نے کھنکار کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے بوتل کو بھر کر اس پر ڈھکن چڑھایا۔ اس کے لیبل کو کپڑے سے صاف کیا پھر اسے نئی بوتلوں کے درمیان رکھ کر میرلن کی طرف متوجہ ہوا۔ میرلن نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جناب یہاں سے کوئی بس گزرتی ہے؟"

"ہاں ہاں۔" اسٹور کیپر نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔ "اسی دکان کے ساتھ ہی بس اسٹاپ ہے' وہاں سے بسیں لوگوں کو شہر تک لے جاتی ہیں تمہیں کہاں جانا ہے؟"

وہ اس سوال سے گھبرا جاتی تھی اسے تنہا دیکھ کر سب یہی پوچھتے تھے کہ اس کی منزل کہاں ہے؟ اس نے فوراً ہی اپنی منزل کا تعین کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نیو اورلین تک جانا ہے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ بڑی دلچسپی سے پھر اس کے سراپا کو دیکھنے لگا مگر اورنج کلر کی شال دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہاں سے ایک بس نیو اورلین کو جاتی ہے۔"

میرلن نے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ایک ہی بس جاتی ہے؟"

"ہاں! اگر وہ اکلوتی بس اپنے وقت پر آئی تو رات کے گیارہ بجے آئے گی۔"

وہ حیرانی سے ایک گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"اوہ مائی گڈنس۔ میں رات کے گیارہ بجے تک کیسے انتظار کروں گی؟"

"تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے پھر ایک بار اس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بڑی آسانی سے لفٹ مل جائے گی۔"

"مجھے امید نہیں ہے کہ یہاں سے اورلین تک مجھے لفٹ مل سکے گی۔"

"اوہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں لفٹ نہیں ملی تھی۔ ابھی اسٹور سے باہر کار سے کون اتر رہا تھا؟"

"جج۔ جی وہ میں ہی تھی۔"

میرلن ایک لمحہ کے لیے بوکھلا گئی اور اس شخص کو حیرانی سے دیکھنے لگی' جو بظاہر

انجان دکھائی دیتا تھا لیکن تھا بڑا باخبر اپنے کام میں مگن رہتا تھا اور دوسروں پر بھی نظر رکھتا تھا۔ میرلن اس کے بوڑھے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے ٹریڈ ویل کہتے ہیں۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی۔ میرلن۔ مجھے میرلن سمتھ کہتے ہیں۔"

"گڈ نیم۔" ٹریڈ ویل نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھوکی ہو۔ تمہیں کچھ کھانا چاہیے۔"

اس نے کچھ سینڈوچز ایک پلیٹ میں رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیئے اور کافی انڈیلنے لگا۔ میرلن انکار نہ کر سکی۔ پتہ نہیں وہ کب سے بھوکی تھی۔ اس نے تیزی سے منہ چلاتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ ٹریڈ ویل نے سوڈے کی ایک بوتل کھولی پھر اسے ایک گھونٹ پینے کے بعد اچانک ہی ایک دھماکہ خیز سوال کیا۔

"تم گھر سے کیوں بھاگی ہو؟"

گرم کافی کا آدھا گھونٹ حلق کے اِدھر اور آدھا اُدھر ہو گیا۔ ایک زور کا ٹھسکا لگا۔ اچانک ہی کھانسی کا زور بڑھنے کے باعث ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور شال گر پڑی۔ بوڑھے ٹریڈ ویل نے بوڑھی آنکھوں کو سکیڑ کر دیکھا۔ اس نوجوان لڑکی کا پیٹ نکلا ہوا تھا۔

وہ جلدی سے شال اٹھا کر اپنے آپ کو اس میں چھپانے لگی۔ ٹریڈ ویل نے نرمی سے پوچھا۔

"کتنے مہینے ہوئے؟ میرا تجربہ کہتا ہے کہ چھ ماہ ہو گئے ہیں۔"

"جی۔ جی ہاں۔ تم میرے بارے میں غلط سوچ رہے ہو۔ میں گھر سے بھاگنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے والدین نیو اورلین میں رہتے ہیں۔ وہ مجھے میری آنٹی کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ اب میں ان سے ملنے جا رہی ہوں۔"

تجربہ کار بوڑھے نے کہا۔

"تم اپنی آنٹی کے پاس تھیں اور اب والدین کے پاس جا رہی ہو مگر تمہاری گفتگو کے دوران کہیں تمہارے شوہر کا ذکر نہیں آیا ایسی حالت میں تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ کسی میٹرنٹی ہوم کی طرف جانا چاہیے۔"

اتنی دیر میں وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"جی ہاں! میں یہی کہنے جا رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد میرے شوہر بھی میرے والدین سے ملنے آئیں گے۔ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔"

ٹریڈ ویل نے لاپروائی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ یوں بھی آج کل کی نسل کو کون سمجھا سکتا ہے۔ کیا اور سینڈوچ کھاؤ گی؟"

"جی نہیں شکریہ۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں کھانے کا کتنا بل ادا کروں؟"

"پانچ ڈالر۔"

"پانچ ڈالر؟" میرلن نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ٹریڈ ویل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تین عدد سینڈوچ اور ایک پیالی کافی کے پانچ ڈالر بہت زیادہ ہیں مگر نادان لڑکی کسی سے کچھ لینے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ اس کے عوض تم سے کیا مانگے گا۔ میں بوڑھا ہوں اس لیے بہت زیادہ رقم مانگ رہا ہوں۔ میری جگہ کوئی نوجوان ہوتا تو........"

وہ پھر اس کے سراپا کو دیکھنے لگا۔ میرلن نے گھبرا کر اپنے ہینڈ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کا بل ادا کرے۔ ٹریڈ ویل نے اس کے ملائم ہاتھ پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آہا۔ رہنے دو۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا کیونکہ میں نے خود تمہیں دعوت دی تھی اور دعوت دینے والے معاوضہ نہیں لیا کرتے۔"

میرلن اسے احسان مندی سے دیکھنے لگی۔ ٹریڈ ویل نے پوچھا۔ "کیا رات گیارہ بجے تک بس کا انتظار کرو گی؟"

"نہیں۔ باہر جا کر کسی سے لفٹ لینے کی کوشش کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی شال سنبھالتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔ ٹریڈ ویل نے نصیحت کی۔

"اس بات کا خیال رکھنا کہ لفٹ دینے والا کوئی نوجوان نہ ہو۔ بوڑھوں کو ان کی عمر مہربان اور شریف بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وش یو گڈ لک اگر کسی بوڑھے سے لفٹ لو۔"

میرلن نے اس کی نصیحت کا شکریہ ادا کرنے کے طور پر مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر

دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ ٹریڈ ویل نے کافی کی پیالی اور برتن کو صاف کیا' انہیں ان کی جگہ رکھا' پھر کھڑکی کے پاس آکر میرلن کو دیکھنے لگا۔

میرلن سر جھکائے' اٹیچی اٹھائے کھڑکی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ وہ اسی جگہ کھڑی رہ کر کسی کار والے کا انتظار کرنا چاہتی تھی لیکن ٹریڈ ویل کھڑکی کے کہر آلود شیشوں کو صاف کرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس بوڑھے کی نظروں کے سامنے کسی سے لفٹ مانگے۔ لفٹ نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنی سبکی محسوس کرتی۔ اسی لیے وہ ذرا آگے بڑھ گئی۔ ٹریڈ ویل اور اس کی کھڑکی کو پیچھے چھوڑنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ کسی بس یا کار والے کا ایسے انتظار کر رہی تھی جیسے سچ مچ اسے نیو اورلین جانا ہو۔ وہ اپنے پاگل پن پر جھنجلا گئی۔ جب سے اس نے گھر چھوڑا تھا' اس کے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سینکڑوں میل کا سفر طے کرنے کے باوجود اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اپنا ٹھکانہ کہاں بنائے گی؟

وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک منی ٹرک اس کے سامنے آکر رکا۔ ایک کالے چہرے نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

ایک نیگرو کے سیاہ چہرے اور چمکتے دانتوں کو دیکھتے ہی وہ ایک قدم یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ نیگرو ایک متعدی مرض ہو۔ اگر اس کی سانس سے سانس ٹکرائے گی وہ بھی کالی ہو جائے گی۔ وہ اپنی نفرت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا........"

نیگرو نے لاپروائی سے ہاتھ نچا کر کہا۔

"آپ کی مرضی' ویسے اس برف باری میں تنہا کھڑی رہنا دانش مندی نہیں ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھی تو میرلن نے دیکھا ٹرک کے پیچھے ایک نیگرو فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اور بڑی سلامتی سے اس فیملی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ شاید اس فیملی میں اسے پناہ بھی مل جاتی مگر کالے چہروں کو دیکھتے ہی اسے وحشت سی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان رہ کر یوں لگتا ہے جیسے جہنم کے شیطانوں میں گھر گئے ہوں۔ ہر لمحہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ان کے چھوتے ہی اپنا رنگ بھی میلا ہو جائے گا۔

وہ سوچتی رہی اور اسے لفٹ دینے والی گاڑی کہیں دور نکل گئی۔ راستے ویران تھے۔ بھولے بھٹکے کوئی راہ گیر یا تیز رفتار گاڑی اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ اس نے کسی گاڑی کی طرف لفٹ کے لیے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی سے لفٹ مانگ کر وہ کیا کہتی کہ اسے کہاں جانا ہے؟ وہ پیدل ہی ایک طرف چل پڑی۔ سورج بادلوں کے پیچھے کہیں چھپا ہوا تھا اور اب تب میں غروب ہونے والا تھا۔ سیاہ بادل ٹوٹ کر برسنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اسے گھبراہٹ سی لگی ہوئی تھی اگر بارش شروع ہو گئی تو وہ کہاں جائے گی؟

وہ بہت دیر تک اور بہت دور تک چلتی رہی آخر کار وہ ہائی وے پر پہنچ گئی۔ اس کے ایک طرف دریا بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ مکانات تھے جنہیں گریڈی نے سمر ہاؤس کہا تھا۔ اس ہائی وے پر وہ تنہا تھی۔ اٹیچی زیادہ بھاری نہیں تھی مگر اب بوجھ لگ رہی تھی۔ خود اس کا وجود اس کے لیے بوجھ تھا جسے وہ گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ اچانک وہ چلتے چلتے رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔

ایک کار تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر لفٹ کے لیے سگنل دیا لیکن کار اسی رفتار سے فراٹے بھرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے تھکن' پریشانی اور غصے سے اٹیچی کو سڑک پر پٹخ دیا مگر وہ غصہ کسے دکھا رہی تھی؟ وہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

بادل کی سیاہی اور کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ ایسے امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے جیسے حبشیوں کی فوج اس پر حملہ کرنے چلی آ رہی ہو۔ پھر حملہ شروع ہو گیا۔ ٹپا ٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر فوراً ہی اٹیچی اٹھائی ننھی بوندوں سے بچنے کے لیے اس نے اٹیچی کو سر پر رکھا پھر دوسرے ہاتھ سے شال کو سنبھالتی ہوئی سامنے والے ایک مکان کی طرف بڑھ گئی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی اور اسے دوڑنے پر مجبور کرنے لگی۔ وہ بھاگتی ہوئی مکان کے پورچ میں آکر ٹھہر گئی۔ پھر وہ اٹیچی کو سر سے اتار کر ہانپنے لگی۔ بارش کا ایک ننھا سا قطرہ ناک پر سے بہتا ہوا ٹپ سے گداز سینے کے درمیان آکر گر پڑا۔ وہ قطرہ وہاں سے پھسلتا ہوا اور بکھرتا ہوا پیٹ تک پہنچا تو اسے جھرجھری سی آئی۔ بڑھتی ہوئی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسے خیال آیا کہ اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے' اس کی حفاظت کے لیے سردی اور بارش سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ کہیں گرم کمرہ ہو آرام دہ بستر ہو اور آتش دان میں آگ روشن ہو ایسے وقت ایسی گرما گرم جگہ جنت کے تصور سے بھی

زیادہ کشش رکھتی ہے۔

جنت کی تلاش میں وہ آگے بڑھی اور اس مکان کے دروازے کو کھولنے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ مقفل تھا۔ ایسا تو کوئی مہربان نہیں ہوتا کہ کسی بھٹکی ہوئی لڑکی کے لیے اپنا مکان کھول کر چلا جائے۔ وہ بارش سے بچنے کے لیے دیوار سے لگ کر آگے بڑھنے لگی اور ہر کھڑکی کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر دیکھنے لگی۔ مکان کے پیچھے پہنچتے ہی تقدیر کو اس کی خانہ بدوشی اور بے سرو سامانی پر ترس آگیا۔ وہاں اس نے ایک کھڑکی کے پٹ کو غصے سے جھنجوڑا تو اس کے لیے راستہ کھل گیا۔ اس کھڑکی کی چٹخنی پہلے سے کمزور تھی۔ بار بار جھنجوڑنے کے باعث وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ میرلن نے گھوم کر دور تک دیکھا اسے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو کر کھڑکی کے راستے اندر آگئی۔

اندر گہری تاریکی تھی۔ دیر تک وہ جس حالت میں آئی تھی' اسی حالت میں کھڑی رہی۔ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اس نے اپنے سینے پر شال کو سنبھالتے ہوئے آواز دی۔

"کوئی ہے؟"

تاریکی میں اس کی آواز چکرانے لگی۔ "کوئی ہے۔ ہے۔ ہے۔ ہے۔"

وہ گھبرا کر کھڑکی سے لگ گئی۔ بعض اوقات اپنی آواز سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنیں بھی ڈراتی ہیں۔ اس کا دل آپ ہی آپ اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے آواز کی بازگشت ابھی تک اس کے سینے میں گونج رہی ہو اور اس کے وجود کو ہلا ہلا کر پوچھ رہی ہو۔

"کون ہے؟ تو کون ہے؟ یہاں کیوں آئی ہے؟ دیکھتی نہیں یہاں ایسا اندھیرا ہے جیسے کالی قوم کے چہروں پر پھیلا رہتا ہے۔ اندھیرے کا یہ کالا رنگ تجھے ڈس لے گا۔"

لیکن وہ دلیر تھی۔ وقتی طور پر سہم گئی تھی اور جب کالوں کی بات آتی تو یہ سوچ کر وہ کچھ اور دلیر بن جاتی کہ غلام اور غربت کے ماروں سے ڈرنا کیسا؟ آگ کا ایک ننھا سا شعلہ اس کالے رنگ کو جلا کر خاک کر دے گا۔ اس نے اٹیچی سے لائٹر نکال کر اسے روشن کر دیا۔ اس کی ہلکی سی روشنی میں کالا رنگ چھٹنے لگا اور وہ بڑا سا کمرہ دور تک نظر آنے لگا۔ اس روشنی میں وہ آگے بڑھتی ہوئی چاروں طرف دیکھنے لگی۔ سب سے پہلے اس نے سوئچ بورڈ کے پاس پہنچ کر کتنے ہی سوئچ آن آف کیے۔ اس نے لائٹر بجھا دیا۔

اندھیرا بدستور قائم تھا۔ ناکامی کی صورت میں اسے خیال آیا کہ سمر ہاؤس کے مالکان اپنے مکانوں کو لاک کرنے سے پہلے بجلی' گیس اور ٹیلیفون کے محکمے والوں کو اطلاع کر دیتے ہیں کہ موسم سرما تک انہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے' اسی لیے یہ تمام چیزیں ڈس کنکٹ کر دی جاتی ہیں۔

وہ دوبارہ لائٹر روشن کر کے اس بڑے ہال سے باہر نکلی۔ پھر ایک کوریڈور سے گزرتی ہوئی کچن میں پہنچ گئی۔ پتہ نہیں اسے کب تک وہاں پناہ لینی تھی' اس لیے وہ کھانے پینے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ ایک بڑی سے کب بورڈ میں کھانے پینے کی بہت ساری چیزیں تھیں۔ کچا راشن بھی تھا اور ڈبوں میں پیک کی ہوئی غذائیں کسی وقت بھی کھانے کے لیے تیار تھیں۔ وہاں اتنا سامان تھا کہ وہ تین ماہ تک مکان سے باہر قدم نکالے بغیر ان کھانوں پر گزارا کر سکتی تھی۔ تلاش کے دوران نعمت خانے میں اسے موم بتیوں کا ایک پیکٹ مل گیا۔ اس نے ایک موم بتی روشن کر لی۔ پھر اسے ایک میز پر رکھ کر مٹی کے تیل کے چولہے کو جلانے لگی۔ تھکن اور بھوک سے اس کا برا حال تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ شکم سیر ہو کر کچن سے باہر آئی اور موم بتی کی روشنی میں اس کوٹھی کے ایک ایک کمرے کو دیکھنے لگی۔ کچھ کمرے مقفل تھے' کچھ کھلے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کو کھول کر اندر قدم رکھتے وقت وہ ذرا سہم سی جاتی تھی کہ کسی کمرے میں کوئی موجود نہ ہو۔ اس بات کا یقین ہونے کے باوجود کہ دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند ہیں یہ لگتا تھا کہ اس ویران مکان میں کوئی چھپا ہوا نہ ہو۔ کوئی انسان نہ ہو اس کی بدروح بھٹکتی پھرتی ہو مگر وہ مکان اس کے دل کی طرح خالی تھا اور راشن کی الماری اس کے پیٹ کی طرح بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ سرہانے ایک موم بتی روشن تھی لیکن بڑی کنجوسی سے اس کا استعمال کرنا تھا۔ اگر موم بتی کا بنڈل ختم ہو جاتا تو اس کے آس پاس تاریکی کے سوا کچھ نہ رہتا۔ اسے پہلی ہی رات سے اندھیرے کا عادی بننا تھا اس لیے اس نے پھونک مار کر اسے بجھا دیا۔ تاریکی میں وہ بہت دیر تک اندر ہی اندر ڈرتی رہی اور لحاف میں چھپ کر صرف آنکھیں نکال کر اِدھر اُدھر گھورتی رہی اور خود کو تسلیاں دیتی رہی کہ مکان باہر سے بند ہے اور جس کمرے میں وہ ہے وہ اندر سے بند ہے۔ وہاں کوئی نہیں آئے گا اسے اطمینان سے سو جانا چاہیے۔

وہ اپنی مرضی سے نہیں نیند کی مجبوری سے سو گئی۔

☆======☆======☆

اس ویران سے مکان میں اس کی ویران سی زندگی گزرنے لگی۔ صبح سے شام تک وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔ پہلے دن اس نے وہاں کی ایک ایک چیز کو اٹھا کر اور اسے جھاڑ پونچھ کر اس کی جگہ رکھا تھا تاکہ اس طرح اسے اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی رہیں۔ اس طرح وہ مکان اندر سے بالکل صاف ستھرا ہو گیا۔ راتوں کو پڑھنے کے لیے بہت سے پرانے رسالے بھی مل گئے۔ کیروسین آئل کا ایک لیمپ بھی مل گیا جسے وہ روشن کر کے اپنے سرہانے رکھتی تھی اور رسالوں کی ورق گردانی کرتی تھی۔ وہ پڑھتی کم تھی اور سوچتی زیادہ تھی۔ کہانی کا کوئی لفظ یا فقرہ اسے اس کے ماضی تک پہنچا دیتا تھا۔ پیار کے سہانے دن یاد آتے تھے۔ ساتھ ہی وہ دکھ بھی یاد آتے تھے جو پیار کرنے والے نے دیے تھے۔

ایک وقت آتا ہے جب محبت کرنے والے سے بھی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اتنی شدید نفرت کہ اسے یاد کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا مگر وہ مجبور تھی' اب جس سے نفرت کرنا چاہتی تھی وہ اس کے اندر چٹکیاں لے رہا تھا۔ کوئی دل میں یاد بساتا ہے' وہ پیٹ میں اس کی یاد بسائے ہوئے تھی اور مجبور تھی کہ اسے نوچ کر اپنے وجود سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے اونگھنے لگی۔ اس کے چہرے کے سامنے ایک رسالہ کھلا ہوا تھا اور نیند سے بوجھل پلکیں جھکتی جا رہی تھیں۔ انگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو رسالہ اس کے منہ پر آ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ مکان کے باہر کوئی کھڑکی یا دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ یا شاید ہولے ہولے جھنجوڑ رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر جلدی سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ وہاں سے ایک دیا سلائی نکالی اور لیمپ کو روشن کرنے لگی۔ پھر اس نے سوچا کہ روشنی کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کوئی نائٹ چوکیدار یا رات کو گشت کرنے والے سپاہی اِدھر آئے ہیں تو وہ مکان کے ایک حصے میں روشنی کو دیکھ کر اسے باہر نکلنے کے لیے کہیں گے۔ وہ ان سے چھپنے کے باوجود نہیں چھپ سکے گی۔ وہ اسے پکڑ کر لے جائیں گے' اس سے طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے۔ اسے سمجھایا جائے گا کہ وہ اپنے والدین کے پاس واپس چلی جائے۔ وہ پولیس والوں کو یہ بتانا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے گھر سے اور اس کے محبوب

نے اسے اپنے دل سے نکال دیا ہے۔

اس کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے جب دل میں کوئی زخم بھی نہیں ہوتا اور وہاں سے ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں۔ ستم یہ کہ اس کا علاج بھی نہیں ہوتا۔ دراصل زخم پیٹ میں تھا۔ وہاں جو بوجھ تھا اسے ہر عورت خوشی سے برداشت کرتی ہے مگر اس نے اپنے طور پر پہلے پہل اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی لیڈی ڈاکٹر نے اس زخم سے نجات نہیں دلائی جو اس کے اندر بڑھتا جا رہا تھا۔

باہر سے آنے والی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس آواز کو سمجھنے کے لیے وہ ہاتھ میں دیا سلائی کی ڈبیا لے کر اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ ایک تاریک مکان میں پندرہ راتیں گزارنے کے بعد وہ اندھوں کی طرح بغیر دیکھے ہر کمرے اور کوریڈور سے گزرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی دبے پاؤں بڑے ہال کی طرف جا رہی تھی۔

مکان کے باہر ایک انسان کا سایہ دیوار سے لگا ہوا یکے بعد دیگرے ہر کھڑکی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی صورت شکل واضح نہیں تھی لیکن یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی مرد ہے۔ دیوار سے لگ کر آگے بڑھتے ہوئے' وہ اسی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا' جس کی چٹخنی اپنی جگہ سے سرک گئی تھی۔

میرلن جب مکان کے پچھلے کمرے میں آئی تو اسے وہی کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی' جسے کھولنے کے بعد وہ اس مکان کی مالکہ بن گئی تھی۔ کھڑکی کے باہر چاند نکلا ہوا تھا۔ اس کی سنہری چاندنی بہت دور تک پھیل رہی تھی۔ اس روشنی میں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکی کے پٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا ہوا کے تیز جھونکوں سے وہ کھڑکی اکثر کھل جایا کرتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں پٹ پھر سے لگا دیے۔ پھر وہاں سے پلٹ کر کچن کی طرف جانے لگی۔ لحاف سے نکل کر اسے سردی لگ رہی تھی اور وہ گرم کافی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

جب وہ کچن میں پہنچی تو وہاں اسے دھیمی دھیمی سپڑ سپڑ کی آواز سنائی دی' جیسے کوئی بلی برتن میں منہ ڈال کر دودھ پی رہی ہو لیکن میرلن برتن میں دودھ بنا کر نہیں رکھتی تھی۔ ضرورت کے وقت ملک پاؤڈر گھول لیا کرتی تھی البتہ اپنے پینے کے لیے ایک برتن میں پانی گرم کر کے رکھتی تھی۔ شاید کوئی بلی یا بلا پانی پی رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑی یہ فیصلہ کرتی رہی کہ اسے ماچس کی تیلی جلا کر اس پانی پینے والے کو دیکھنا چاہیے یا نہیں۔ ماچس کی تیلی اس کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔ وہ اندھیرے میں رہنے والی' روشنی سے ڈر رہی تھی۔ پھر اس نے دل کو تسلی دی کہ کوئی بلی ہی ہو سکتی ہے اسے ڈرنا نہیں چاہیے۔ یہ حوصلہ پیدا کرتے ہوئے اس نے تیلی روشن کر دی۔

وہ پانی پی کر اسی طرف آ رہا تھا۔ روشنی ہوتے ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور میرلن کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔

"نیگرا........"

وہ چیختے ہی پلٹ کر بھاگنے لگی۔ وہ بھی اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"رک جاؤ۔ شور مچاؤ گی تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔"

وہ دھمکی کے باوجود بھاگتی رہی۔ اِدھر اُدھر دوسری چیزوں سے ٹکراتی رہی۔ وہ اچھی طرح سے سمجھتی تھی کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے مگر اس وقت بدحواسی میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس تاریکی میں اسے بیڈ روم کا راستہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ نیگرو بھی گرتے پڑتے اس کا پیچھا کرتا جا رہا تھا۔ بڑے ہال میں پہنچ کر وہ پیانو پر گر پڑا۔ پیانو کے ریڈز پر اس کا بوجھ پڑتے ہی ایک زبردست جھنجھناتی ہوئی بینگ کی آواز گونجنے لگی۔ اس آواز نے مکان کے تمام سناٹے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میرلن کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اسے یوں لگا جیسے اس آواز نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ پھر اس نے اپنے وجود پر اس آواز کے بوجھ کو محسوس کیا۔ اب وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

"خبردار۔ اب یہاں سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرو گی تو اسی جگہ ٹانگیں توڑ کر بٹھا دوں گا۔"

وہ اس پر سے ہٹ گیا لیکن اس کے ایک بازو کو مضبوطی سے پکڑے رہا۔ میرلن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اندھیرے میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن چشم تصور میں وہ مختصر سا منظر دکھائی دے رہا تھا' جب اس نے کچن میں تیلی جلا کر اسے دیکھا تھا۔ چشم تصور میں وہ ایسے نظر آ رہا تھا جیسے رات کی تمام سیاہی سمٹ کر ایک نیگرو کے وجود میں ڈھل گئی ہو۔ اب بھی وہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کالی رات کی طرح موجود تھا۔ کالے میں کالا رنگ مل گیا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں سے اندر آنے والی

ہلکی ہلکی چاندنی میں صرف اس کی آنکھیں جنگلی بلے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ دہشت سے نہیں بلکہ نفرت سے کانپنے لگی۔ پنچ نسل کے لوگوں سے دہشت کیسی؟ ہاں یہ بات نفرت انگیز تھی کہ کالے ہاتھ نے گورے گورے بازو کو حاکمانہ انداز میں جکڑ رکھا تھا۔

"چھچھ۔ چھوڑو مجھے........"

وہ اپنا بازو چھڑانے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔ اس کی ناکام کوشش کے باعث گرفت اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بھاری بھرکم سرگوشی میں کہا۔

"اپنی آواز کو قابو میں رکھو۔ کیا تم مرنا چاہتی ہو؟"

وہ تعلیم یافتہ گوروں کے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ میرلن نے پہلے کسی نیگرو کو اتنی شستہ انگریزی بولتے نہیں سنا تھا۔ وہ کسمسائی ہوئی بولی۔

"مجھے جانے دو۔" پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اونچی آواز میں بول رہی ہے۔ اس نے فوراً ہی دھیمی آواز میں کہا۔

"تم کیسے پتھر ہو میرا بازو دکھ رہا ہے۔ چھوڑ دو مجھے........"

اس نے بازو پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں بڑے ہال میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں پھر اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"کون؟"

"تمہارے والدین۔"

"میرے والدین؟" وہ چند ساعت کے لیے ہچکچائی پھر جلدی سے بولی۔

"وہ۔ وہ لوگ میری آنٹی کے یہاں گئے ہیں۔"

اسے اس بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں اسے سر سے پاؤں تک گھورتی ہوئی بولیں۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں اکیلی ہو؟"

"آں۔ ہاں۔ نہیں۔" وہ بوکھلا گئی۔ "وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔"

وہ گھورتی ہوئی آنکھیں مسکرانے لگیں۔

"اس کے ساتھ والے مکان میں تالا پڑا ہوا ہے۔ کیا یہ سب سمر ہاؤس نہیں ہیں؟"

میرلن نے سوچا اگر وہ اقرار کرے گی تو یہ حبشی یہاں جم کر بیٹھ جائے گا۔ اس نے

کہا۔

"ہاں! ہمارے پڑوسی یہاں سے جا چکے ہیں مگر ہم برفباری سے لطف اندوز ہونے کی لیے کچھ عرصے کے لیے یہاں ٹھہر گئے ہیں مگر میں یہ سب کچھ تم سے کیوں کہہ رہی ہوں؟ کیا تم کوئی پولیس آفیسر ہو؟ تم مجھ سے سوالات کرنے والے کون ہوتے ہو؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ میرے ڈیڈی کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ تم ان کے سامنے ایک کمزور بچے ہو۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے مار کھا کر نکلو گے۔"

"میں بچہ نہیں ہوں۔ تیس برس کا ایک مکمل مرد ہوں۔ کیا میرے ہاتھ کی گرفت تمہیں کچھ نہیں سمجھا رہی ہے؟"

وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر الگ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح پیچھا چھڑا کر اپنے بیڈ روم میں چلی جائے اور دروازے کو اندر سے بند کر لے۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ بند کمرے سے باہر کیوں آئی تھی۔ اگر وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ کھڑی رہتی تو وہ نیگرو اس مکان کو خالی سمجھ کر اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں چرا کر وہاں سے چلا جاتا مگر وہ خود ہی اپنی حماقت سے اس کے سامنے آگئی تھی۔ ایسی صورت میں چور ہو یا شریف آدمی' ایک جوان لڑکی کو دیکھ کر ضرورت کی دوسری چیزوں کو بھول جاتا ہے اور صرف اسے چرانے کے جتن کرنے لگتا ہے مگر وہ سوچ رہی تھی کہ اب کچھ بھی ہو وہ اسے اپنے قریب آکر اسے چھونے کا موقع بھی نہیں دے گی۔ نیگرو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ماچس کہاں ہے؟ روشنی کرو۔"

وہ غصے سے بولی۔

"اپنا لہجہ درست کرو۔ میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں۔"

اس نے شائستگی سے کہا۔

"سوری۔ پلیز روشنی کرو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کہاں ہوں؟"

اس شائستگی کے پیش نظر اسے روشنی کرنی پڑی۔ تیلی کے سلگتے ہی کمرہ ذرا دور تک روشن ہو گیا۔ بہت کچھ دکھائی دے رہا تھا مگر میرلن اس کالے چہرے کو دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ کالے چہرے نے کہا۔

"ٹیلیفون کہاں ہے؟"

وہ ناگواری سے بولی۔

"کیا تمہیں یہاں کوئی ٹیلیفون نظر آ رہا ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلا کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ پھر دو تین سوئچ کو آف کر کے دیکھنے لگا۔ میرلن نے پوچھا۔

"تم یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' میں یہاں کس لیے آسکتا ہوں؟"

"تم بھوکے ننگے لوگ چوری ہی کرنے آسکتے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"میرا خیال ہے ہم دونوں کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ ذرا گھبرا کر بولی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"ٹیلیفون نہیں ہے۔ بجلی بند ہے۔ کچن میں گیس کی بجائے کیروسین آئل کا چولہا رکھا ہوا ہے۔ گیس' پانی' بجلی سب کچھ بند ہے۔ اس گھر کے مالک مہینوں بعد واپس آئیں گے اور تم۔ تم بھی میری طرح اس گھر میں آئی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ پاؤں پٹخ کر بولی' پھر اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کے لیے دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ حالانکہ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ماچس کی تیلی بجھ چکی تھی۔ اندھیرا پھر سے مسلط ہو گیا تھا۔ اس اندھیرے میں اس کی آواز سنائی دی۔

"تم اس تاریکی میں نہیں رہتی ہو گی۔ حسین لڑکیاں جہنمی تاریکی سے گھبراتی ہیں۔ تم نے روشنی کا کچھ انتظام تو کیا ہو گا۔ اگر موم بتی ہو تو اسے روشن کر دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ یہاں تم نے کھانے کا بھی انتظام کر رکھا ہو گا۔"

وہ ایک تیلی روشن کرتی ہوئی بولی۔

"یہ لو ماچس' کچن میں موم بتی اور کھانا سب کچھ ہے پیٹ بھر کر کھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس نے ماچس لینے کے بجائے دوبارہ اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

"عورت کی موجودگی میں مرد کچن میں کام کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ چلو۔"

وہ اسے کھینچ کر کچن کی طرف لے جانے لگا۔ وہ کالی گرفت میں کسمساتی ہوئی جانے لگی۔ کچن میں پہنچ کر اس نے سوچا کہ غصہ دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اسے اچھی طرح کھلا پلا کر ہنستے بولتے رخصت کر دینا چاہیے۔ اگر وہ یہاں سے ضرورت کی کچھ چیزیں چرا کر لے جانا چاہے گا تو وہ اسے چوری کی بھی اجازت دے دے گی مگر کسی طرح اس سے پیچھا چھڑا لے گی۔

اس نے ایک موم بتی روشن کی' پھر الماری کھول کر جیلی کا ایک ڈبہ اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کالے نے بھری ہوئی الماری کو دیکھتے ہی سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹوں کو سکوڑ کر کہا۔

"ویری گڈ۔ تم نے تو پوری سپر مارکیٹ پر ڈاکہ ڈالا ہے۔"

"یہ سب کچھ یہاں موجود تھا جب میں یہاں.........."

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ بھی کالوں کی طرح چور ہے اور یہاں چور راستے سے آئی ہے اور چوروں کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ وہ بات بناتی ہوئی بولی۔

"یہ سب کچھ میں نے مسٹر ٹریڈ ویل کی دکان سے خریدا ہے۔ ان پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔"

"یہ ٹریڈ ویل کون ہے؟"

"ایک اسٹور کا مالک ہے۔ یہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اس کا جنرل اسٹور ہے۔ وہ اکثر میری خیریت پوچھنے یہاں آتا ہے۔ تمہیں کھانے کے بعد فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

"کیا وہ تم سے یہ سوال نہیں کرتا کہ تم تنہا دوسرے کے مکان میں کیوں رہتی ہو؟"

"آں۔ ہاں۔ وہ.........."

اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے میرلن کے گورے اور چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور کہا۔

"گورا اور چمکتا ہوا رنگ جھوٹ کی طرح ناپائیدار ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ماند پڑتا جاتا ہے۔ میری مس چمکیلی تم نے یہ شاپنگ نہیں کی ہے۔ یہ کھانے کا تمام سامان یہاں پہلے سے موجود تھا۔ ہم دونوں اس کے برابر کے حقدار ہیں۔"

وہ ایک مکان مالکہ کی طرح اسے گھورتی ہوئی بولی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ کیا یہ کھانے کا سامان چرا کر لے جاؤ گے؟ ٹھیک ہے تم آدھے کے حقدار ہو۔ آدھا سامان یہاں سے لے جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"میں اتنا بوجھ اٹھا کر کہاں لے جاؤں گا' یہیں بیٹھ کر روز تھوڑا تھوڑا کھاتا رہوں گا۔"

"میں تمہیں گولی مار دوں گی۔"

"کیا یہاں پستول بھی ہے؟ مارنے کے لیے تو عورت کی نظر کافی ہوتی ہے۔ اوہو میں نے تو ادھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

وہ اس کے پیٹ کو گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ اپنا پیٹ چھپانے کے لیے جلدی سے دوسری طرف گھوم گئی۔ نیگرو نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"یہ کس کا ہے مس چمکیلی؟"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔

"مجھے چمکیلی کیوں کہتے ہو؟"

"پھر کیا کہوں؟ اپنا نام بتا دو۔ ویسے بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف ہو جانا چاہیے۔ ہم یہاں اجنبی بن کر نہیں رہ سکتے۔"

"اپنی حیثیت دیکھ کر بات کرو۔ میں ایک ہی چھت کے نیچے کسی کالے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"نہ رہو۔ یہاں سے چلی جاؤ مجھے تو پتہ نہیں کہ میں یہاں کب تک رہوں گا۔"

وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھتی ہوئی یوں دانت پیسنے لگی جیسے عالم خیال میں اس بدمعاش کی ہڈیاں چبا رہی ہو۔ وہ بسکٹ کا ڈبہ کھول کر کھانے بیٹھ گیا۔ پھر ایک نمکین بسکٹ کے ساتھ جیلی کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"غصہ تھوک دو' ہم کالوں نے بھی یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ دھوپ اور چھاؤں ایک ہی جگہ گڈمڈ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ تم گورے لوگ ہم سے جتنی نفرت کرتے ہو' اس سے بھی زیادہ نفرت ہم تم سے کر سکتے ہیں مگر ہم سوچتے ہیں کہ محبت سے ہم ایک ہونا چاہیں اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنا چاہیں تو ہمیں ضرور محبت کے راستے پر چلنا چاہیے مگر تم لوگ بہت دولت مند ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اپنے دکھ درد کا علاج خود ہی کر سکتے ہو۔

کوئی کالا تمہاری بیمار تہذیب کا مسیحا نہیں بن سکتا مگر قسمت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ تمہارے کسی دکھ نے یا کسی مجبوری نے تمہیں یہاں لا کر تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ہم دونوں اس مکان میں آ گئے ہیں یعنی ایک ایسے جزیرے میں پہنچ گئے ہیں جس کے چاروں طرف پانی ہے۔ کیا تم اس جزیرے سے نکل کر پانی میں ڈوبنے جا سکو گی؟"

"میں نہیں جا سکتی۔ تم تو جا سکتے ہو۔ تم مرد ہو۔"

"بعض اوقات مرد بھی حالات سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ بڑی تلاش کے بعد مجھے ایک اچھی پناہ گاہ ملی ہے۔"

"کیا تم کوئی مجرم ہو۔ قانون کے محافظوں سے چھپ رہے ہو؟"

"اگر میں کچھ کہوں گا تو میرا مکمل تعارف ہو جائے گا۔ اگر تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو پہلے اپنا تعارف کراؤ۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

"میرا نام میرلن اسمتھ ہے۔"

"میرا نام احمد علی ہے۔"

وہ نفرت سے بولی۔

"ایک تو کالے ہو اوپر سے مسلمان۔ اونہہ۔"

"تمہاری نفرتیں ہمیں مسلمان بنا رہی ہیں۔ تمہارے یہاں گورے اور کالے چرچ الگ ہیں مگر کالے اور گوروں کی مسجدیں الگ نہیں ہیں۔ کیا تم نے تصویروں اور فلموں میں نہیں دیکھا کہ ہر رنگ اور ہر نسل کے مسلمان ایک ہی وقت میں ایک ہی خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں؟ تم لوگ سب کچھ دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو مگر حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ نہ کرو ہم نے اپنی فلاح کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ تم نفرت سے ہونٹ سکوڑ سکتی ہو مگر ایک کالے مسلمان سے دور اس مکان سے باہر نہیں جا سکتیں۔ اگر اتنی ہی شدید نفرت ہے تو یہاں سے جا کر بتاؤ۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہاں سے جاتی ہوئی بولی۔

"میں سونے کے لیے جا رہی ہوں تم میرے کمرے کی طرف نہ آنا۔"

وہ واپس جاتے جاتے ٹھٹک گئی۔ باہر کسی اُلو کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ احمد علی کی سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیسی آواز ہے۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا

"یہ کیسی آواز ہے؟ کیا کوئی آ رہا ہے؟"

"یہ اُلو کی آواز ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "کیا تم نے کبھی اُلو نہیں دیکھا؟"

"اس کی مادہ کو دیکھ رہا ہوں۔"

وہ تلملا کر آگے بڑھی جیسے قریب آ کر اس کا گلا دبوچ لے گی مگر قریب آ کر وہ رک گئی۔ کالے رنگ کو چھوتے ہوئے گھن آنے لگی۔ وہ اپنے غصے پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

"ایک تنہا اور مجبور لڑکی کا مذاق اڑانا شرافت اور مردانگی نہیں ہے۔"

"تمہاری پوری قوم ہم مٹھی بھر کالوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ کیا یہ شرافت اور مردانگی ہے؟"

"میں تنہا ایسا نہیں کرتی۔"

"جھوٹ۔ تم یہاں تنہا رہ کر بھی مجھ سے وہی سلوک کر رہی ہو۔ کالے رنگ سے اپنی نفرت کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو مگر یہ نفرت تمہاری حرکتوں سے ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ تمہیں اس رنگ سے نفرت نہیں ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنا رنگ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ منہ پھیر کر بولی۔

"کالا رنگ کوئی پسند نہیں کرتا۔"

"صرف گورے پسند نہیں کرتے۔ دنیا کی دوسری قوموں نے کبھی ہم سے نفرت نہیں کی۔ کیا ہم اپنی مرضی سے یہ رنگ لے کر پیدا ہوئے ہیں؟"

"نہیں! یہ سب خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ خدا نے کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا بنایا ہے۔ کسی کو حکومت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور کسی کو غلام بننے کے لیے۔ کسی کو گورا رنگ دیا ہے تاکہ اس سے محبت کی جائے۔ کسی کو کالا بنا دیا کہ اس سے ڈر کر دور بھاگا جائے۔"

"یہ تم جیسے لوگ کہتے ہیں۔ خدا نے جتنے انسان پیدا کیے ہیں' وہ پیدائشی طور پر قابلِ نفرت نہیں ہوتے۔ ان کی غلطی انہیں قابلِ نفرت بناتی ہے یا پھر ایسے لوگ جو بہت زیادہ دولتمند ہوتے ہیں اور خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے دوسروں کو ہر ممکن طریقے سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تم نے یہ دیکھا کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تم سے سبقت لے جا رہے ہیں اور

مساوی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں تو تم لوگوں نے رنگ اور نسل کا جھگڑا شروع کر دیا۔ ہماری تاریخ کے پچھلے اوراق الٹ کر اب یہ کہتے ہو کہ ہم پہلے غلام تھے اب بھی غلام ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ آئندہ ہم کس صورت میں ابھریں گے' یہ آنے والا وقت بتائے گا۔"

"میں آنے والے وقت کا انتظار کرنے کے لیے تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہوں گی۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس گھر پر میرا حق ہے کیونکہ میں تم سے پہلے یہاں آئی ہوں۔"

"یہ تاریخی دعویٰ ہے کہ امریکہ میں تمہارے باپ دادا پہلے آئے ہیں' بعد میں ہمارے باپ دادا غلام بنا کر لائے گئے۔ جو پہلے آتا ہے وہ اپنا حق جما لیتا ہے' یہ نہیں سوچتا کہ خدا کی زمین پر ہر انسان کے حقوق برابر ہیں۔ وہ اپنی طاقت سے بعد میں آنے والوں کو کچل دیتا ہے۔ میں بھی اس گھر میں تمہارے بعد آیا ہوں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ طاقت سے اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ یہاں میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ اگر میں تمہیں مار کر پھینک دوں گا اور اس گھر کا تنہا مالک بن جاؤں گا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ بولو کیا میں تمہارے ساتھ یہی سلوک کروں جو پورے امریکہ میں ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے؟"

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ تنہا نیگرو اپنی پوری قوم کی صورت میں اس کے سامنے ابھر رہا ہے اور اب اپنی طاقت سے اسے کچل کر اس جگہ سے بے دخل کر دے گا۔ وہ سہم کر بولی۔

"خبردار میرے قریب نہ آنا میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کچن سے باہر چلی گئی۔ احمد علی نے ہنستے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"تم سونے کے لیے نہیں' کروٹیں بدلنے کے لیے جا رہی ہو۔ ایک کالی طاقت کو ابھرتے دیکھ کر تمہاری پوری قوم بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہے۔"

اس نے درست کہا تھا۔ میرلن بستر میں پہنچ کر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نے بیڈ روم کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا تھا لیکن یہ خیال اسے ستا رہا تھا کہ دوسرا شخص اقتدار حاصل کرنے کے لیے وہاں آ گیا ہے اور وہ کالا بھی ہے۔ اس نے لیمپ بجھا دیا۔ لیمپ کے بجھتے ہی رات کا کالا وجود اس پر چھا گیا۔

☆======☆=====☆

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں ٹھک ٹھک کی آواز آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کھڑکی یا دروازے کو ٹھونک رہا ہے۔ وہ لحاف سے نکل کر اپنا لباس درست کرتی ہوئی بیڈ روم سے باہر آئی۔ باہر کھڑکیوں سے دن کی روشنی جھلک رہی تھی۔ جب وہ مکان کے پچھلے کمرے میں آئی تو احمد علی کو دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ گہری نیند سے اٹھنے کے بعد وہ اس کالے کو بالکل ہی بھول گئی تھی اور یوں اٹھ کر چلی آئی تھی جیسے اپنے باپ کے گھر میں ہو اور کسی دستک پر دروازہ کھولنے جا رہی ہو۔ اب اس کالے کو دیکھتے ہی پچھلی رات کی تمام تلخیاں یاد آ گئیں۔

احمد علی کھڑکی کی ٹوٹی ہوئی چٹخنی درست کر چکا تھا۔ اس نے میرلن کو دیکھ کر کہا۔

"دیکھو یہ اب مضبوطی سے بند ہو جاتی ہے۔ اب کوئی تیسرا شخص اس مکان کا حصے دار بننے نہیں آئے گا۔ ٹوٹے ہوئے گھر کو بنانا مرد کا کام ہے۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ کچن میں جا کر ناشتہ تیار کرے مجھے یقین ہے کہ تم اپنا فرض ادا کرو گی۔"

"میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں۔ میں تمہارا کوئی کام نہیں کروں گی۔"

"یہاں کوئی کسی کا ملازم نہیں ہے' کوئی کسی سے کمتر نہیں ہے۔ جھوٹے غرور سے باز آؤ ورنہ میں ایک مرد کی طرح حاکم بن کر بھی تمہیں کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ کچن میں آیا تو میرلن اس وقت قدرے سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا آج بھی تم یہاں رہو گے؟"

"تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں تمہارے قدموں میں جھک جاؤں گا اور تمہارا حکم سنتے ہی یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ مس میرلن' اپنی احمقانہ برتری کے احساس سے باز آ جاؤ مگر میں تمہیں مس کیوں کہہ رہا ہوں۔ ایک ماں بننے والی عورت مس تو نہیں کہلاتی؟"

میرلن نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر اس کے آگے ناشتے کی پلیٹیں رکھنے لگی۔ احمد علی ناشتے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"پچھلی رات میں نے تم سے پوچھا تھا کہ یہ ہونے والا بچہ کس کا ہے تم نے جواب نہیں دیا۔ یقیناً یہ کسی گورے کا ہو گا۔ اگر تم یہ جواب دو گی تو تمہاری زبان سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ گوروں میں بھی شیطان ہوتے ہیں جو اپنی ہی جیسی ایک گوری عورت کو بچہ

دینے کے لیے ایک ویران سے مکان میں چھوڑ جاتے ہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے بولی۔

"کوئی مجھے چھوڑ کر نہیں گیا ہے' میں خود یہاں آئی ہوں۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ گوروں نے تمہیں اپنی سوسائٹی سے دھکے دے کر نکال دیا ہے اور تم ہماری طرح ٹھوکریں کھاتی ہوئی یہاں پناہ لینے آگئی ہو۔"

"یو شٹ اپ۔" وہ غصے سے چیخ کر بولی۔ "مجھے گھر سے نکالا گیا ہے اپنی سوسائٹی سے نہیں.........."

"تم حقیقت سے انکار کر رہی ہو۔ اگر اس حالت میں سوسائٹی تمہیں قبول کرتی تو تم یہاں بے یارو مددگار نظر نہیں آتیں۔ سوچو' ذرا غور کرو کہ کوئی اپنے گھر سے' اپنی سوسائٹی سے اور اپنوں کے دل سے کیسے نکالا جاتا ہے اور کیوں نکالا جاتا ہے؟"

"کیوں نکالا جاتا ہے؟" میرلن نے پوچھا۔

"اس لیے نہیں کہ وہ گورا یا کالا ہوتا ہے۔ اس کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہارا دامن داغدار ہو گیا ہے۔ اس لیے نکالی گئی ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم غریب اور پسماندہ قوم کے افراد ہیں اس لیے ہم تمہاری سوسائٹی سے نکالے جاتے ہیں۔ کہیں سے بھی نکالے جانے کی معقول وجوہات ہوتی ہیں۔ رنگوں کا امتیاز کوئی معقول وجہ نہیں ہے اگر ہے تو تم گوری ہو کر گوروں سے ٹھوکریں کیوں کھا رہی ہو؟"

وہ بیٹھے بیٹھے میز پر جھک گئی اور منہ چھپا کر رونے لگی۔ توہین کا احساس اسے رُلا رہا تھا۔ ایک کالے نے کتنی زبردست چوٹ کی تھی اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اپنی ہی نسل اور اپنے ہی رنگ کے لوگوں نے اسے ٹھکرایا تھا۔ ٹھوکر کھانے کے اتنے عرصے بعد یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ وقت اور حالات کے مطابق اپنے ہی لوگ گورے رنگ پر بھی کیچڑ اچھالتے ہیں۔

اسے روتے دیکھ کر احمد علی کو دکھ ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اسے سمجھانے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی کو کہتے ہیں کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ کسی کے آنسو پونچھنا انسانی فرض ہے۔"

اس نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرلن کو ہوش آگیا کہ وہ کس بات پر رو رہی تھی اور بالکل صحیح طرح چوٹ لگنے پر رو رہی تھی۔ خود اس کا ذاتی تلخ تجربہ بتا رہا تھا کہ احمد علی نے سچ بات کہی ہے۔ اس نے کالے کا رومال لیا مگر آنکھ پونچھنے کی بجائے ناک پونچھ کر واپس کر دیا۔ لاشعوری طور پر یہ بھی نفرت کا اظہار تھا کہ کالوں کا رومال صرف ناک صاف کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

وہ کچھ کہے سنے بغیر کچن سے باہر آگئی۔ بیڈ روم کی طرف جاتے وقت اس کے دماغ میں یہ بات نہیں تھی کہ اس نے احمد علی کے رومال کا غلط استعمال کیا ہے۔ وہ ایک شاخ کی طرح ذرا سا لچک گئی تھی۔ ٹھکرائے جانے والی حقیقت کے سامنے ذرا سی جھک گئی تھی' اس لیے دانستہ احمد علی سے نفرت کا اظہار کرنے سے کترا رہی تھی۔ ناک صاف کرنے والی حرکت غیر شعوری طور پر سرزد ہوئی تھی۔

وہ اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی اور اپنے پیٹ کو لحاف میں چھپا کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ پیٹ اس کی توہین کر رہا تھا اس بات کا کھلا اشتہار بن گیا تھا کہ اپنوں نے اسے ٹھکرایا ہے۔ اگر احمد علی اس اشتہار کو نہ پڑھتا تو وہ ٹھوکر کھانے کے باوجود اپنے گورے رنگ پر فخر کرتی رہتی مگر اس کی یہ کمزوری کالے دشمن کے ہاتھ آگئی تھی اس لیے وہ اب بظاہر کالے رنگ سے نفرت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

اکثر وہ رسالہ کھول کر سوچ میں گم ہو جاتی تھی۔ آنکھیں رسالے کو پڑھتی تھیں اور دماغ اپنے حالات پڑھتا رہتا تھا۔ اس طرح رسالے کی باتیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کیا پڑھا اور دماغ نے کیا سمجھا؟

اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ احمد علی کے سوا اور کون آسکتا ہے۔ وہ اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بدستور کھلے ہوئے رسالے کا پردہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ تمہیں کسی لڑکی کے بیڈ روم میں نہیں آنا چاہیے۔"

"اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک عورت اور ایک مرد ہو تو تکلفات کے پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرلن نے رسالہ ایک طرف پھینک کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بے تکلفی پسند نہیں ہے‘ چلے جاؤ یہاں سے..........“

”میں واپس جانے کے لیے ہی آیا ہوں‘ تم ذرا ذرا سی بات پر مشتعل کیوں ہو جاتی ہو؟ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ جب تک ہم یہاں ہیں ہمیں ایک دوسرے کی تکلیف کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”تم میری فکر نہ کرو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔“

”مجھے تو ہے۔ میں رات بھر سردی کے باعث سو نہ سکا۔ بڑے ہال کا قالین اپنے اوپر لپیٹ کر پڑا رہا۔ تمہارے پاس ایک لحاف اور ایک کمبل ہے۔ لحاف تم رکھو اور کمبل مجھے دے دو۔ ورنہ میں سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤں گا۔“

”مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ تم کب مرو گے؟“

احمد علی نے آگے بڑھ کر بستر سے ایک کمبل اٹھا کر کہا۔

”میرا پیچھا کرنے والے دشمن بھی مجھے نہ مار سکے۔ تمہاری خواہش کیا مارے گی۔“

”اوہ! میں تو یہ بھول ہی جاتی ہوں کہ تم یہاں ایک مجرم کی طرح چھپنے آئے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا جرم کیا ہے؟“

”میرا جرم یہ ہے کہ میں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اس زمین پر اپنے جیسے لوگوں کے لئے عزت سے زندہ رہنے کا حق مانگا تھا۔“

”تو پھر بھاگ کر یہاں کیوں آ گئے؟“

”میں بھاگ کر نہیں آیا ہوں۔ تم گوروں کے کالے قانون نے مجھے بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔ طلباء نے کیمپس سے ایک جلوس نکالا تھا۔ میں انگلش کا پروفیسر ہوں۔ طلباء اور طالبات کے اس جلوس میں‘ میں سب سے آگے تھا۔ جب ہم مین روڈ پر آئے تو تمام لوگ سڑک کے اطراف تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمارے بینرز دیکھ کر اور ہمارے مطالباتی نعرے سن کر ہمارا مذاق اڑانے لگے۔ کبھی تالیاں بجانے لگے۔ ہم بڑی بے نیازی سے آگے بڑھتے گئے۔ یہ دیکھ کر وہ پتھر برسانے لگے۔ مجبوراً ہمیں مقابلہ کرنا پڑا ہم تعداد میں کم تھے لیکن متحد تھے۔ تھوڑی دیر تک جم کر لڑائی ہوتی رہی۔ پھر پولیس کی ایک جمعیت آ گئی اور جلوس میں شریک ہونے والے افراد کو گرفتار کرنے لگی۔ میں بھاگ کر

ایک گلی میں گھس گیا۔ ایک گورے نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر میرا پیچھا کیا۔ گلی ک
آخری موڑ پر ایک ٹیلیفون بوتھ تھا۔ میں وہاں سے مڑتے ہی بوتھ کے اندر چھپنے کے ل
گھس گیا۔ وہ گورا بھی بہت چالاک تھا۔ مجھے چھپتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بوتھ ک
اندر گھس کر مجھے پکڑنا چاہا۔ وہ میرا ہم عمر تھا لیکن جسمانی طور پر مجھ سے کمزور تھا‘ میں
اس کی گردن دبوچ لی۔ اسی وقت بہت سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ہا
سے گردن دبا کر دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ بوتھ کے قریب ہی مجھے ایک پولیس
والے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ کالا شیطان اسی طرف بھاگتا ہوا آیا ہے۔ یہیں کسی گلی میں گیا ہے۔ تم لوگ
اُدھر جاؤ ہم اِدھر جاتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ جب
اطمینان ہو گیا کہ میرے آس پاس کوئی نہیں ہے تو میں نے اس گورے کی گردن پر ا
گرفت ڈھیلی کر دی مگر اسے دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی دیر تک اس
گلے کو دبائے رکھنے کے باعث وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔“

”مائی گاڈ!“ میرلن نے سہم کر حیرانی سے کہا۔ ”تم قاتل ہو۔ تم نے ایک گورے
ہلاک کیا ہے۔“

”میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں مارا ہے۔ تمہارے لوگ دیکھنے میں لمبے تڑ
ہیں۔ مگر چٹکی میں دباؤ تو چیونٹی کی طرح مر جاتے ہیں۔“

”آئی ہیٹ یُو۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی چلے جاؤ یہاں سے۔“

وہ کمبل اٹھا کر دروازے تک گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولا۔

”مس چمکیلی۔ تمہاری قوم کے جس چمکیلے مرد نے تمہیں ٹھکرایا ہے اسے بھی
میں مسل ڈالوں تو تم مجھ سے نفرت کرو گی یا میرا احسان مانو گی؟“

وہ اپنے سوال کا جواب سنے بغیر چلا گیا۔ میرلن اپنا پیٹ پکڑ کر بستر پر جھک گئی۔ ا
گولہ سا اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ احمد علی کا سوال بھی اس
دماغ میں پھر رہا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی۔

”واقعی جس محبوب نے دشمن بن کر مجھے دھوکہ دیا ہے اگر وہ مرجائے تو مجھے خ
ہو گی؟ اس کے لئے میں گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے میں در د

ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گا اور میں اس ویران سے مکان میں بے یارو مددگار پڑی ہوں۔ اسے میری ذرا بھی پرواہ نہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔ جی رہی ہوں یا مر رہی ہوں۔ میں اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتی کہ میں اب اس کے لئے ایک کھوٹا سکّہ ہوں جسے پلٹ کر وہ راستے سے نہیں اٹھائے گا۔ کچھ بھی ہو اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ اس نفرت کرنے والے سے اس لئے نفرت نہیں کر سکتی تھی کہ اس طرح عورت کی انانیت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ کسی دوسرے کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسے ایک کھوٹا سکّہ سمجھ لیا گیا ہے۔ پھر میں اس کالے آدمی کے سامنے کیوں نہ جھوٹ بولوں کہ وہ جو گورا ہے' اندر سے کالا نہیں ہے۔ اس نے مجھے نہیں ٹھکرایا ہے' میں اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ ہاں میں اسے چھوڑ کر.........“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک جھوٹی محبت کا بھرم رکھنے کے لئے کتنے قیمتی آنسو ضائع کرنے پڑتے ہیں۔

☆=======☆======☆

دو ماہ اور کتنے ہی ہفتے گزر گئے۔ وہ دونوں تنہا ایک جزیرے میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ وہاں سے نکل کر کسی دوسرے ساحل کی طرف نہیں جا سکتے تھے۔ وہ دونوں اپنی عادات کے مطابق اکثر لڑتے تھے۔ پھر حالات سے مجبور ہو کر صلح کر لیتے تھے۔ مگر اتنے دن گزر جانے پر لڑائی جھگڑے کچھ کم ہو گئے تھے۔ کیونکہ پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ راشن ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میرلن اسے الزام دیتی تھی۔

”تمہارے یہاں آنے سے راشن جلد ختم ہو رہا ہے۔ تم بہت پیٹو ہو۔“

”میں پیٹو نہیں ہوں۔ تم پیٹ والی ہو۔ راشن کا زیادہ حصہ تمہارے اس پھولے ہوئے پیٹ میں جاتا ہے۔ میں کھانے والا ایک ہوں اور تم دو ہو۔ اگرچہ دوسرا ابھی وجود میں نہیں آیا ہے۔ انسان اناج کا کیڑا ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی ماں سے اپنے حصے کی خوراک مانگتا ہے۔“

وہ جھنجلا کر بولی۔ ”تم خواہ مخواہ بحث شروع کر دیتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ اب ہمارا گزارا کیسے ہو گا۔“

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔“

”میں عورت ہوں' کچھ نہیں کر سکتی۔ تمہیں باہر جا کر کچھ راشن کا انتظام کرنا

چاہیے۔ آخر تم کب تک چھپے رہو گے۔ جب اس مکان کے لوگ آئیں گے تو تمہیں
ہی پڑے گا۔“

اس نے اپنی کلین شیو ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں سے نکل
دور جا سکتا ہوں۔ مگر مجھے تمہاری فکر ہے۔ زچگی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ تم راشن
بغیر اور کسی نرس کے بغیر کیسے خود کو سنبھالو گی؟“

”میں تمہاری ہمدردی کی محتاج نہیں ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔“ وہ دوسری ط
منہ پھیر کر بولی۔ وہ اکثر اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا کرتی تھ
وہ خوب سمجھتی تھی کہ اس وقت احمد علی کی محتاج ہے اس کی موجودگی سے بہت بڑا س
ملتا ہے۔ مگر اپنا غرور بھی تو کوئی چیز ہے۔ وہ عورت ہی کیا جو خود کو انانیت کے پردے
نہ چھپا سکے۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی۔ احمد علی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ مکان کے ق
ہی کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ احمد علی لپک کر کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑک
باہر دن کی روشنی ڈوبنے والی تھی۔ چاروں طرف کہر چھائی ہوئی تھی۔ اس کہر میں پو
والوں کی ایک ویگن نظر آئی۔ کچھ سپاہی ویگن سے اتر کر آس پاس کی کوٹھیوں کی طرف
رہے تھے۔ ایک آفیسر اپنے ایک سپاہی کے ساتھ اسی مکان کی طرف آ رہا تھا۔ احمد علی
سانس اوپر کی اوپر رہ گئی میرلن بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ تم کبھی نہ کبھی پکڑے جاؤ گے اور تمہاری وجہ سے
پر بھی مصیبت آئے گی۔“

وہ اسے شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھنے لگی جیسے اب تب میں رونے ہی
ہو۔ احمد علی اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کھڑکی کے قریب ہی دیوار
چپک گیا۔ پھر دبی ہوئی سرگوشی میں بولا۔

”ایک دم خاموش رہو۔ کھانسنے اور کھنکارنے کی آواز بھی نہ نکالنا ورنہ وہ سمجھ
گے کہ یہ مکان آباد ہے۔“

وہ بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ لگے کھڑے رہے اتنے عرصے ک
پہلی بار کالے بدن سے گورا بدن لگ رہا تھا۔ میرلن نے اس سے الگ ہونے کا ارادہ ک
لیکن دروازے اور کھڑکیوں پر کھٹکھٹانے کی آوازیں سن کر وہ احمد علی کے قریب جم ک

گئی تھی۔

باہر پولیس والے دروازے کو اور کھڑکیوں کے ایک ایک پٹ کو باری باری جھنجوڑ کر دیکھ رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے اس کھڑکی کے قریب آ رہے تھے جس کے ساتھ والی دیوار سے وہ دونوں چپکے کھڑے تھے۔ اس کھڑکی کے پاس آ کر بھاری بوٹوں کی آواز تھم گئی تھی۔ دونوں نے اپنی سانسیں روک لیں بچنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ وہ زندہ ہو کر مردوں کی طرح خاموش رہیں اور آنے والوں کو اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیں۔

احتیاطی تدابیر کے باوجود اچانک ہی میرلن کے پیٹ میں درد اٹھنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو پکڑ لیا۔ احمد علی نے دیکھا کہ وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے والی ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنا کالا ہاتھ اس کے گلابی ہونٹوں پر رکھ دیا اور سہمے ہوئے انداز میں سر ہلا کر اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ کسی طرح اپنی تکلیف برداشت کر لے' منہ سے آواز نہ نکالے۔ اتنے میں کھڑکی کے قریب ایک پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

"وہ دیکھو۔ وہاں تمہیں کچھ نظر آ رہا ہے؟"

دوسرے کی آواز سنائی دی۔ "کہاں؟ کیا اندر کوئی ہے؟"

پہلی آواز نے کہا۔ "اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ انگلش کا پروفیسر احمد علی.........."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میرلن بے اختیار احمد علی سے لپٹ گئی۔ احمد علی کی محتاجی سے انکار کرنے کے باوجود وہ اس مضبوط سہارے سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ چلا جائے گا تو پھر کون اس سے لڑنے جھگڑنے والا' اس کی تنہائی دور کرنے والا رہے گا۔ ٹھیک ہے کہ وہ کسی گورے کو جگہ نہیں دے سکتی تھی مگر اس کی موجودگی سے بہت سی پریشانیاں کم ہو جاتی تھیں یہی کیا کم تھا۔ باہر سے پھر ایک آواز سنائی دی۔

"یہ سگار دو چار کش کے بعد بجھ جاتا ہے' اسے سلگانے کے لئے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ انگلش کا کالا پروفیسر احمد علی اتنا احمق نہیں ہے کہ قاتل بننے کے بعد اسی علاقے میں چھپتا پھرے گا۔ مگر ہمارے آفیسر کہتے ہیں کہ احتیاطاً سمر ہاؤس وغیرہ میں دیکھ لیا جائے۔ یہاں کے تمام دروازے باہر سے لاکڈ ہیں اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند ہیں۔ چھوٹے روشندانوں سے اتنا بڑا آدمی اندر جا کر نہیں چھپ سکتا۔"

"لیکن آپ نے اندر یہاں کچھ دیکھا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"اوہ' میں بھول گیا ہوں۔ وہ دیکھو.......... میں اس ٹی وی کو دکھا رہا تھا۔ میں نے بالکل ایسا ہی ایک ٹی۔ وی بہت ہی سستے داموں خریدا ہے۔ الزبتھ بہت دنوں سے ٹی۔ وی کی ضد کر رہی تھی۔"

"اچھا اچھا' واقعی بہت عمدہ ٹی۔وی ہے۔ اپنی بیوی کو خوش کرنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔"

باتیں کرنے والوں کی آوازیں دور جانے لگیں۔ میرلن اور احمد علی پانچ منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے پھر احمد علی نے ذرا جھک کر کھڑکی کے پار دیکھا۔ آس پاس کی کوٹھیوں میں جانے والے سپاہی دوبارہ ویگن میں آ کر بیٹھ گئے تھے پھر وہ ویگن اسٹارٹ ہو کر جدھر سے آئی تھی' ادھر واپس جانے لگی۔ تب احمد علی نے میرلن کی طرف توجہ دی۔ وہ اپنے بدن کا تمام بوجھ اس پر ڈالے ہوئی تھی اور اب تکلیف کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا اور اس کے بیڈ روم میں لے جانے لگا۔ میرلن نے اس کے بازو میں اپنا منہ چھپا لیا شاید وہ یہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ کس کے بازوؤں میں جا رہی ہے۔

احمد علی نے اسے بستر پر لٹا کر اس پر لحاف ڈال دیا۔ اس کے چہرے سے درد و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ احمد علی نے ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرلن! اس طرح تو تم مر جاؤ گی۔ مجھے اس بات کا تجربہ نہیں ہے کہ وقت قریب آئے تو کیا کرنا چاہیے۔ یہاں کسی تجربے کار عورت کا ہونا ضروری ہے۔"

"میں کسی کو یہاں نہیں بلا سکتی۔ کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتی۔" وہ درد سے کراہتی ہوئی بولی۔

"پاگل نہ بنو۔ خود کو ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ تم نے شاید اب تک نفرت کرنے والوں کو دیکھا ہے' اسی لئے محبت کرنے والوں سے دور بھاگتی ہو۔ تمہارا تجربہ اس دنیا کا آخری تجربہ تو نہیں ہے۔ میں آج رات کسی میٹرنٹی ہوم میں جاؤں گا۔"

"نہیں۔ وہ تمہیں گرفتار کر لیں گے۔"

"میں کسی طرح بچ نکلنے کی کوشش کروں گا۔ تم نے سنا نہیں کہ پولیس والے کیا باتیں کر رہے تھے۔ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ میں اس علاقے سے دور جا چکا ہوں۔ میرے جیسے کتنے ہی نیگرو یہاں آباد ہیں۔ وہ فوراً میری شناخت نہیں کر سکیں گے۔"

"پھر بھی خطرہ ہے۔"

"خطرہ میرے لئے ہے۔"

"وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔"

"میں اپنی جان کی پروا کروں گا تو ایک کے بجائے دو کی جان جائے گی۔ تمہاری زندگی اور تمہارے بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہم تینوں میں سے کسی ایک کی زندگی کو داؤ پر لگانا ہو گا۔ خدا کرے کہ تمہاری تکلیف میں کچھ کمی آجائے۔ ابھی رات ہو رہی ہے۔ میں کم از کم تین گھنٹے بعد یہاں سے نکلوں گا۔ اس وقت چاروں طرف سناٹا چھا جائے گا۔ تم اطمینان رکھو میں کمرے کے باہر رہوں گا۔ تکلیف ناقابلِ برداشت ہو تو مجھے کہہ دینا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میرلن اس خالی دروازے کو دیکھتی رہی جہاں سے وہ گزر کر گیا تھا۔ بہت کچھ گزر جانے کے بعد کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہوتی ہے۔ وہ، جن پر اسے ناز تھا، انہوں نے اس کی خبر تک نہیں لی تھی اور جس رنگ سے وہ اپنے باپ دادا کی طرح صدیوں سے نفرت کرتی آئی تھی۔ وہ رنگ اس کی اُجلی رنگت اور شگفتگی کے لئے اور اس کے ہونے والے بچے کی زندگی کے لئے خود کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ محبت اور قربانی کا جذبہ صرف ایک قوم یا صرف ایک ہی شخص کی جاگیر نہیں ہوتا۔ جو بظاہر قابلِ نفرت نظر آتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ زندگی کے چراغوں کو کس طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک روشن رکھا جاتا ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی اور ایک کالے انسان کے گورے جذبے کے آگے ہارتی رہی۔

☆=======☆======☆

احمد علی کمرے کے باہر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک مکمل سکوت رہا۔ پھر میرلن کی کراہیں سنائی دینے لگیں۔ عورت تخلیق کے کرب سے کس طرح گزرتی ہے؟ ایسی درد بھری آوازیں وہ پہلی بار سن رہا تھا۔ وہ پیٹ پکڑے درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔ احمد علی نے کمرے کے اندر آکر کہا۔

"مجھ سے تمہاری تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ میں جا رہا ہوں، تمہیں تھوڑی دیر تک تنہا رہنا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جلد ہی تمہارے لئے ایمبولینس لے آؤں گا۔"

وہ درد سے تڑپتی ہوئی بولی۔ "نہیں احمد! وہ تمہیں پہچان لیں گے۔"

"پہچاننے دو۔ میں اپنے لئے دو زندگیوں کو تباہ نہیں کر سکتا۔"

"ضد نہ کرو احمد! مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا ہوں۔ نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر موت سامنے آئی تو اس یقین کے ساتھ مروں گا کہ تم جس نئی نسل کو جنم دے رہی ہو، وہ کالوں سے نفرت نہیں کرے گی۔"

میرلن کی نظریں جھک گئیں۔ درد کچھ تھم گیا تھا صرف ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں جنہیں وہ برداشت کر سکتی تھی۔ یوں بھی اس کی ساری توجہ اور ساری سوچ درد سے ہٹ کر اس انسان پر مرکوز ہو گئی تھی جو باہمی نفرتوں کو مٹانے کے لئے بڑے صبر کے ساتھ آئندہ نسل کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ وہ جانے لگا تو میرلن نے اسے آواز دی۔

"ٹھہرو۔ میری ایک بات مان لو۔"

اس نے پلٹ کر پوچھا۔ "کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"تم میٹرنٹی ہوم کی طرف نہ جاؤ۔ میں اس علاقے کے متعلق کچھ نہیں جانتی لیکن اتنا سمجھتی ہوں کہ میٹرنٹی ہوم کسی چھوٹے سے ٹاؤن میں ہو گا۔ ٹاؤن کا کوئی نہ کوئی شخص تمہیں دیکھ کر پہچان لے گا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ اس وقت تمہیں فوری امداد کی ضرورت ہے۔"

"میں امداد سے انکار نہیں کرتی۔ مگر تمہارے بچاؤ کی صورت بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم ٹریڈ ویل کے اسٹور پر جاؤ۔ وہ جگہ نسبتاً سنسان ہے۔ تم اس کے اسٹور میں جا کر کسی میٹرنٹی ہوم سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔"

"لیکن میں وہاں فون پر گفتگو کروں گا تو ٹریڈ ویل وہ باتیں سنے گا۔"

"ہاں، وہ تو ضرور سنے گا.........پھر؟"

"پھر وہ پوچھے گا کہ میں کس حاملہ عورت کے لئے فون کر رہا ہوں اور ایمبولینس لانے کے لئے کسی سمر ہاؤس کا پتہ کیوں بتا رہا ہوں۔ ان دنوں تمام سمر ہاؤس ویران پڑے ہوئے ہیں۔ کیا وہ شبہ نہیں کرے گا؟"

میرلن نظریں جھکا کر سوچنے لگی' پھر اس نے کہا۔ "اسے شبہ نہیں کرنا چاہئے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اس کوٹھی کے ملازم ہو۔ تمہارا صاحب یہاں سے جاتے وقت تمہیں اور تمہاری بیوی کو کوٹھی کی نگرانی کے لئے چھوڑ گیا ہے۔"

یہ کہتے وقت اس کی نظریں جھک گئیں۔ کیونکہ وہ خود کو اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔

احمد علی حالات کا مارا تھا۔ اس کے دل میں کسی کی بیوی یا محبوبہ بنانے کا جذبہ نہیں تھا۔ جذبے سرد پڑ گئے تھے۔ حالات کے طمانچوں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے صرف اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس سے اعلیٰ مقصد اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ایک عورت کی نفرت کو کسی حد تک محبت میں بدل چکا تھا۔ اگرچہ میرلن نے اس کی محبت کا زبان سے اقرار نہیں کیا تھا مگر یہ سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ ضرورت کے پیچھے خود غرضی چھپی رہتی ہے۔ چھپی رہے' انسان کو صرف اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہئے۔"

"جیسا کہ تم کہہ رہی ہو' وہی باتیں میں ٹریڈ ویل سے کہوں گا۔ لیکن ایمبولینس کے لئے مجھے میٹرنٹی ہوم سے رابطہ قائم کرنا ہوگا جو گوری عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ کیا ٹریڈ ویل یہ نہیں پوچھے گا کہ میں کالا ہو کر اپنی کالی بیوی کے لئے کالوں کے میٹرنٹی ہوم سے رابطہ کیوں نہیں قائم کرتا؟ تم گورے لوگوں نے ہمارے درمیاں جو خلیج حائل کر دی ہے میں اتنی جلدی اسے کیسے پاٹ سکتا ہوں؟"

پھر درد اٹھنے لگا۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔ اچھا ہوا کہ درد اٹھ گیا' وہ جواب نہ دے سکی۔ کیونکہ وہ جواب نہیں دے سکتی تھی۔ تھوڑی دیر تک کراہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تم یہ نہ کہنا کہ تم اس کوٹھی کے ملازم ہو۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ تم اس کوٹھی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ یہاں ایک عورت کے کراہنے کی آواز سنی۔ کوٹھی کے اندر جا کر تم نے پتہ چلایا کہ ایک عورت وہاں تنہا ہے اور وہ اب تب میں ماں بننے والی ہے۔ اسی کے لئے تم فون کرنے اسٹور میں آئے ہو۔ تم یہ اطلاع دینے کے بعد کہیں بھی جا کر چھپنا چاہو گے تو ٹریڈ ویل تمہیں نہیں روکے گا۔ بلکہ تمہارا احسان مند ہوگا کہ ایک گوری عورت کی خاطر تم نے اتنی دور برفباری میں آنے کی زحمت اٹھائی۔"

احمد علی تھوڑی دیر تک اس کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"ہاں' یہ اچھی تدبیر ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔ میرلن نے پھر اسے آواز دی۔ "سنو! جلدی نہ کرو' اچھی طرح سوچ لو۔"

"اب سوچنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟" احمد علی نے پوچھا۔

"دیکھو احمد! تم یہ بھول رہے ہو کہ نیگرو کس لہجے میں گفتگو کرتے ہیں تم شستہ انگریزی بولتے ہو۔ ٹریڈ ویل کو شبہ ہو جائے گا کہ کہیں تم انگریزی کے پروفیسر تو نہیں ہو۔ اس چھوٹے سے علاقے میں تم اب تک کافی مشہور ہو چکے ہو۔"

"ہاں۔ یہ ایک اہم پوائنٹ ہے۔ وہاں جا کر مجھے ایک عام نیگرو کے لہجے میں باتیں کرنا چاہئے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں گفتگو کے سلسلے میں بھی محتاط رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا آیا۔ میرلن کے کراہنے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھی۔ اس نے مکان کے پچھلے کمرے میں آ کر وہی کھڑکی کھولی جو ان کی آمد و رفت لیے مخصوص کی گئی تھی۔ کھڑکی سے باہر آ کر اس نے دونوں پٹ بھیڑ دیئے۔ پھر کوٹ کے کالر کو اٹھا کر اپنے کانوں اور آدھے چہرے کو چھپاتا ہوا ٹریڈ ویل کے اسٹور کی طرف جانے لگا۔

باہر آ کر پتہ چلا کہ سردی کیسی غضب کی ہے۔ کہر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی تھی۔ آگے کا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ وہاں کے تمام راستوں سے واقف تھا لہٰذا یادداشت کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً ایک میل کا راستہ طے کرنے کے بعد اسے کسی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ اس کے سامنے بہت دور سے ہیڈ لائٹس کی روشنی کہر کو چیرتی ہوئی قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ جلدی سے راستہ چھوڑ کر دوسری طرف ذرا دور چلا گیا۔ وہ پولیس کی گاڑی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ عادی مجرم نہیں تھا' اس لئے پولیس والوں کے تصور سے کانپ رہا تھا۔ شدید سردی بھی اسے کانپنے پر مجبور کر رہی تھی اور یہ حوصلہ بھی تھا کہ وہ قانون کی گرفت میں آئے بغیر ایک مجبور اور بے سہارا عورت کے کام آنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

گاڑی تیزی سے گزرتی ہوئی چلی گئی۔ وہ کہر کے دبیز پردوں میں چھپا رہا۔ اسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ گاڑی پلٹ کر نہیں آئے گی تو وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ قدم قدم پر دھڑکا لگا ہوا تھا اور وہ دل کو تسلیاں بھی دیتا جا رہا تھا کہ ہائی وے کے آس

پاس کا علاقہ اس وقت بالکل ویران اور سنسان رہتا ہے' کوئی اسے دیکھ نہیں سکے گا۔ دیکھ بھی لے تو کیا ہے؟ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہر دیکھنے والا اسے قاتل کی حیثیت سے پہچان لے۔ چونکہ وہ ایک قاتل بن چکا ہے اس لئے اپنے قدموں کی آہٹ سے بھی گھبرا رہا ہے۔

اس نے ٹریڈ ویل اسٹور تک کا راستہ ایسی ذہنی اذیتوں کے ساتھ طے کیا جیسے صدیوں کی مسافت طے کرتا ہوا آ رہا ہو۔ اس وقت اسٹور کھلا ہوا تھا لیکن ٹریڈ ویل نے دروازے پر بورڈ لگا دیا تھا کہ "فروخت بند ہے۔"

اس نے اسٹور کے دروازے پر پہنچ کر چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔ اگر کوئی دور کھڑا ہوا ہو تو کہر کی وجہ سے نظر نہیں آسکتا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے دل دھڑک رہا تھا کہیں دکان کا مالک پہچان نہ لے۔ مگر اندر تو جانا ہی تھا۔ آخر وہ اتنی سردی میں اتنی دور آیا ہی کیوں تھا؟ اس نے چشم تصور میں تنہا میرلن کو درد سے کراہتے اور تڑپتے دیکھا پھر فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

ٹریڈ ویل کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور سر جھکائے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز ہوتے ہی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اتنی رات گئے ایک کالے آدمی کو دیکھ کر اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"اتنی رات کو آئے ہو۔ دکان بند ہو چکی ہے۔"

احمد علی نے ایک عام نیگرو کی طرح خود کو احساس کمتری سے سکیڑ لیا۔ پھر خوشامدانہ انداز میں دانت نکالتے ہوئے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بگڑی ہوئی انگریزی میں بولنے لگا۔

"ہم خریدنے نئی آیا ہے۔ ایک ضرورت سے آیا۔ ہم ادھر سمر ہاؤس کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کے رونے کی آواز سنائی دیا۔ ہم ادھر میں جا کے دیکھا۔ وہ اک دم اکیلا ہے اور ماں بننا لگتا ہے اس کو مدد کا ضرورت ہے۔"

ٹریڈ ویل نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کس سمر ہاؤس کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاؤس نمبر ففٹی ٹو........ یہ مکان لبِ سڑک ہے۔"

اس کی زبان سے عادتاً ایک بہت ہی عمدہ فقرہ ادا ہو گیا ہے۔ جاہل گنوار نیگرو۔

"لبِ سڑک" جیسی لفظوں کی ترکیب استعمال نہیں کرتے۔ اس نے گھبرا کر ٹریڈ ویل کو دیکھا۔ لیکن شاید ٹریڈ ویل نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ اس تجسس میں گرفتار تھا کہ ایک ویران سمر ہاؤس میں ایسی کون تنہا عورت ہے جو ماں بننے والی ہے' اس نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہے ہو؟"

"جی نہیں۔ ہم ایک دم سچ بولتا ہے۔ تم اُدھر میں جا کے دیکھ لو۔ اس کو جلدی سے مدد پہنچاؤ۔ نئ تو وہ اور اس کا بچہ مرجائے گا۔"

ٹریڈ ویل اسے اُلجھی ہوئی اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے تکنے لگا۔ پھر اس نے سر ہلا کر کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں ایمبولینس کے لئے فون کرتا ہوں مگر تمہیں ایمبولینس کے آنے تک یہاں ٹھہرنا ہو گا۔"

"کیوں؟" اس نے ذرا سہم کر پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہاری بات اگر غلط ہوئی تو ایمبولینس والے وہاں جا کر نہیں پچھتائیں گے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ "ہمارا جرم کیا ہے؟ ہم نیکی کرتا ہے۔ ایک کالا آدمی ہو کے گوری عورت سے ہمدردی کرتا ہے۔"

"بے شک اگر یہ ہمدردی ہے تو تم قابلِ تعریف ہو۔ ہم سب تمہاری عزت کریں گے مگر پہلے جھوٹ اور سچ کا علم ہو جانا چاہیے۔ کیا تم ایمبولینس کا انتظار کرنا پسند کرو گے؟"

وہ انکار نہ کر سکا۔ اگر انکار کرتا تو ٹریڈ ویل یہ سمجھ لیتا کہ ایک کالا آدمی خواہ مخواہ اسے پریشان کرنے آیا ہے۔ صرف اسے ہی نہیں بلکہ اتنی شدید سردی میں میٹرنٹی ہوم والوں کو بھی پریشان کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس طرح میرلن تک مدد بھی نہیں پہنچ سکے گی۔

اس نے جواب دیا۔ "ہاں میں انتظار کروں گا۔ آپ فوراً ہی ایمبولینس کے لئے کال کریں۔"

ایسا کہتے وقت پھر اس کی زبان اور لہجہ بدل گیا تھا۔ ٹریڈ ویل نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر فون کرنے کے لئے پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ وہ پارٹیشن سامان رکھنے والے اونچے ریک سے بنایا گیا تھا۔ وہ ریک اوپر سے نیچے تک سامان سے بھرا ہوا تھا لیکن ایک

طرف تھوڑی سی جگہ اس حد تک خالی رہ گئی تھی جہاں سے دکان کا پورا منظر نظر آتا تھا۔ بوڑھا ٹریڈ ویل پارٹیشن کے پیچھے آکر اسی جگہ کھڑے ہو کر چپ چاپ احمد علی کو دیکھنے لگا۔

احمد علی کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے ٹریڈ ویل کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور انتظار کرنے کے دوران اس کاغذ کو پڑھ رہا تھا جس پر ٹریڈ ویل تھوڑی دیر پہلے کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی فرم کو مال کا آرڈر دینے کے لئے ایک خط لکھتے لکھتے اسے ادھورا چھوڑ گیا تھا۔ اب احمد علی کی نظریں بار بار اس خط پر پڑ رہی تھیں اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر بڑے ذہنی کرب میں مبتلا ہو رہا تھا کیونکہ ٹریڈ ویل نے اپنے اس خط میں کئی جگہ انگریزی زبان کی غلطیاں کی تھیں۔

وہ انگلش کا پروفیسر جو ایک جاہل نیگرو بن کر آیا تھا' اس سے وہ غلطیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی انگلیوں کو توڑ مروڑ رہا تھا۔ ان انگلیوں کو کاغذ اور قلم تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔ مگر وہ ایک پروفیسر تھا غلطیوں کی اصلاح کرتا تھا۔ وہ ایک سچا انسان تھا جو نفرتوں کو مٹا کر محبت کا درس دینے نکلا تھا۔ وہ کسی غلطی کو کب تک برداشت کر سکتا تھا۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود قلم اٹھا کر تصحیح کرنے لگا۔

دس منٹ کے بعد ٹریڈ ویل ایک ہاتھ میں کافی کی پیالی اور دوسرے ہاتھ میں ایک دو نالی بندوق اٹھا کر کاؤنٹر کے پیچھے آگیا۔ احمد علی اسے دیکھتے ہی سہم گیا۔ ٹریڈ ویل نے مسکرا کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ لو یہ کافی پیو۔"

اس نے کافی کی پیالی اس کے آگے رکھ دی اور کاغذ اٹھا کر بولا۔ "تم اس پر کچھ لکھ رہے تھے' ذرا میں بھی تو دیکھوں۔"

اس نے جیسے ہی کاغذ کو اٹھایا' احمد علی پلٹ کر جانے لگا۔ ٹریڈ ویل نے بندوق اٹھا کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے للکارا۔

"خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ میں گولی چلا دوں گا' اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

احمد علی کو اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ ٹریڈ ویل کاؤنٹر کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے بندوق تھامے اسے نشانے پر رکھے کھڑا تھا اور نظریں جھکا کر کاؤنٹر پر رکھے ہوئے کاغذ کو پڑھ رہا تھا اور محتاط نظروں سے اس کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے احمد علی کو

تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"فائن۔ تم انگریزی زبان کے استاد معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ نام نہ بتا سکا۔ تھوک نگل کر رہ گیا۔ ٹریڈ ویل نے کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے' میں بتاتا ہوں۔ میں تمہاری باتوں کے دوران ہی کھٹک گیا تھا۔ تم نے ایک بار بہت ہی فصیح زبان میں ایک بات کہی تھی۔ وہ کیا بات تھی؟ مجھے یاد نہیں مگر اسی وقت میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ تم ایک جاہل نیگرو بن کر دھوکہ دینے آئے ہو۔ اب بتاؤ کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ میں کیسے یقین کروں کہ مکان نمبر ففٹی فور میں واقعی کوئی عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس مکان میں ایک نوجوان لڑکی سخت تکلیف میں ہے۔ وہ تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔"

"مجھے جانتی ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس کا نام کیا ہے؟"

"میرلن اسمتھ۔"

بوڑھا ٹریڈ ویل زیرِ لب میرلن کا نام بڑبڑانے لگا۔ وہ ایسی تھی کہ اسے ایک بار دیکھ کر بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ٹریڈ ویل کو جلد ہی یاد آگیا کہ اب سے تقریباً ڈھائی یا تین ماہ سے پہلے وہ اسٹور میں آئی تھی۔ وہ اس لئے یاد رہ گئی تھی کہ کم عمر ہونے کے باوجود چھ ماہ کا پیٹ لے کر آئی تھی۔ اس نے اپنا نام میرلن بتایا تھا۔ وہ سر ہلا کر بولا۔

"ہاں۔ میرلن نامی ایک لڑکی اسٹور میں آئی تھی' وہ حاملہ بھی تھی۔ میرے حساب سے اسے اب تک ماں بن جانا چاہیے۔ مگر وہ تو نیو اورلین جانا چاہتی تھی۔ یہ تقریباً تین ماہ پہلے کی بات ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ کا حساب درست ہے۔ اس سمر ہاؤس میں وہ تین ماہ سے رہتی آ رہی ہے۔ میں خود تقریباً اڑھائی ماہ سے اس کے ساتھ.........."

اس کی زبان بے لگام ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہ سنبھل گیا مگر ٹریڈ ویل نے مسکرا کر کہا۔

"آخر تمہارا ایک اور جھوٹ کھل گیا۔ اس کا اور تمہارا کئی ماہ کا ساتھ ہے۔ آخر تم جھوٹ کا پلندہ بن کر کیوں آئے ہو؟ دیکھو لڑکے! میں جھوٹوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ تمہاری حقیقت معلوم کرنے کے لئے میں نے میٹرنٹی ہوم کے علاوہ پولیس اسٹیشن میں فون کیا

ہے۔ انہیں تمہارا حلیہ بتایا ہے۔ وہ لوگ اب یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔"

احمد علی کے پیروں تلے سے جیسے زمین سرکنے لگی۔ پولیس کے آدمی پہنچنے ہی والے تھے۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ اب بھی فرار کا موقع ہے۔ وہ میرلن کے لئے اپنا فرض ادا کرچکا ہے' ایمبولینس اسے ہسپتال لے جائے گی۔ اب اسے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔

یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے اچانک بندوق کی نال پکڑ کر اوپر اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے بوڑھے کے منہ پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ مار کھا کر کاؤنٹر کے پیچھے گرا اور وہ بھاگتا ہوا اسٹور سے باہر نکل گیا۔ ٹریڈ ویل نے جلدی سے اُٹھ کر اسے للکارا۔ پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے لپکا۔

جب احمد علی سڑک پر پہنچا تو اچانک سامنے سے آنے والی پولیس کار کی ہیڈ لائٹس اس پر پڑی۔ ٹریڈ ویل نے باہر آکر ہوائی فائر کیا۔ دوسری طرف پولیس والوں نے اسے پہچان لیا۔ دو طرف سے گھیرے جانے کے بعد وہ تیسری طرف بھاگنے لگا۔ اسی وقت پولیس کار سے ایک فائر ہوا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ احمد علی اچھل کر اوندھے منہ گر پڑا۔

ٹھائیں.......... ٹھائیں کی آواز میرلن کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اس کنواری ماں کا وجود چھلنی ہو رہا تھا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کرسمس نائٹ ہے۔ کنواری مریم نے مسیح کو جنم دیا ہے۔ تخلیق کے چشمے سے بہتا ہوا خون میٹرنٹی ہوم میں پھیل رہا ہے اور تہذیب کی ٹوٹی ہوئی صلیب سے ایک کالے مسلمان کا لہو ٹپک رہا ہے۔

☆==========☆========☆